جلد ۱۴۳ ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۹ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۸۹ء عدد ۳

مضامین

شذرات

نظام کائنات کے قیام وبقا کے لیے عدل وقسط کا قیام ناگزیر ہے، اس لیے جب حق وعدل کا نظام پامال ہونے لگے تو ضروری ہے کہ دردمند لوگ اس کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو جائیں اور اس نظام کو کوئی صدمہ نہ پہونچنے دیں، لیکن اگر لوگ حق وعدل کے لیے فکرمند اور بے چین نہ ہوں اور اس کے بنیادی قانون کو تباہ ہوتے دیکھ کر بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے مواخذہ سے بچ نہیں سکتے، قرآن مجید نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جن کے اندر ایسے نازک وقت میں بھی حق وعدل کی حمایت کے لیے غیرت وحمیت اور ملک وقوم کو ہلاکت سے بچانے کے لیے جوش وولولہ پیدا نہیں ہوتا، اس نے اس سے بھی آگاہ کیا ہے کہ "اس فتنہ سے بچو جو خاص کر ان ہی لوگوں کو نہیں پہونچے گا جھوں نے تم میں سے ظلم کیا ہے۔" (انفال : ۲۵)

درحقیقت حق وعدل سب کی متاع مشترک ہے، اس لیے اس کو بچانا، ظالموں کا ہاتھ پکڑنا اور لوگوں کو اجتماعی معصیت سے باز رکھنا سب کی ذمہ داری ہے، یہود خدا کی ہدایت وشریعت سے محروم اور ملعون ومغضوب اسی لیے قرار پائے کہ انھوں نے حق وعدل کے قانون کو تباہ کیا اور قسط کی دعوت دینے والے انبیاء وصلحاء کو قتل کرنے کا سنگین جرم بھی کیا۔

ہندوستان کے موجودہ ابتر حالات کسی بھی دردمند انسان کو بے چین اور بے قرار کر دینے والے ہیں، ملک کا موجودہ انتشار، علمی واخلاقی انحطاط، فکر ونظر کا ہمہ گیر فساد اور ذہن ودماغ کے رگ وریشہ میں نفوذ کر جانے والا روگ خیر امت کی حیثیت سے مسلمانوں پر بھاری ذمہ داری عائد کرتا ہے اور انھیں اس کی دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کا مداوا تلاش کریں، اور موجودہ حالات میں خاموش تماشائی بنے رہنے کے بجائے ملک وقوم کو تباہی سے بچانے کے لیے حق وعدل کے نظام کو پامال نہ ہونے دیں بلکہ ان قوتوں کو پسپا کر دینے کے لیے اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں جو ان کی بیخ کنی میں لگی ہوئی ہیں ع

معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

لیکن کیا خود مسلمانوں کا حال کچھ کم زبوں ہے، ان کے آپس کے اختلافات نے ان کو بالکل ہی بے دم بنا دیا ہے، آئے دن ان کے جان ومال اور عزت وآبرو کی تباہی کے جو ہولناک اور شرمناک واقعات پیش آرہے ہیں وہ اسی شجرۂ اختلاف کے برگ وبار ہیں، قرآن مجید نے باہمی جنگ جدال کو عذاب الٰہی سے تعبیر کیا ہے، آج امت مرحومہ مختلف فرقوں اور گروہوں میں بٹی ہوئی ہے اور قرآن مجید کے بموجب اللہ تعالیٰ ایک جماعت کا عذاب دوسری جماعت کو چکھا رہا ہے، یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی ہو رہی ہے، لیکن اس کا دکھڑا وہ کب تک روئیں گے، شکوہ وشکایت میں کب تک اپنی توانائی اور وقت ضائع کریں گے اور عمل سے فارغ ہو کر تقدیر کا بہانہ کب تک بنائیں گے، ان کی تاریخ گواہ ہے کہ ان کے سر پر اس سے بڑھ کر ادبار کی گھٹا چھاتی رہی ہے اور اس سے زیادہ فلاکت اپنا سماں دکھاتی رہی ہے لیکن ان کے ہوش وتدبر، عزم وحوصلہ اور جوش عمل نے ہمیشہ حالات کا رخ موڑ دیا، آج بھی وہ اپنے اخلاص، حسن عمل، پاکیزہ سیرت اور بلند اخلاق سے اپنے ملک کے لیے مفید، موثر اور باعث خیر وبرکت ہو سکتے ہیں۔

اس وقت پٹنہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کی وجہ سے علمی وتحقیقی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا ہے، اس کے ڈائرکٹر جناب عابد رضا بیدار نے اپنی خوش انتظامی سے لائبریری کو ہمہ جہتی ترقی دی ہے، وہ سال میں بڑے پیمانے پر دو سمینار کراتے ہیں، اور اہم علمی موضوعات اور قومی وملی مسائل پر ممتاز اہل علم وفن کو توسیعی خطبات دینے کے لیے بھی مدعو کرتے ہیں، خدا بخش جنوبی ایشیائی علاقائی سمینار گزشتہ پانچ برس سے ہو رہا ہے، اس سال کا سمینار قرآنیات (تفسیر وترجمہ) کے مخطوطات عربی وفارسی کے لیے مخصوص تھا جو ۲۲ تا ۲۶ فروری کو ہوا، سمینار کے بعض اجلاس اہم مطبوعہ تفاسیر کی قدر وقیمت کے تعین خصوصاً مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے تفسیری افکار پر بحث کے لیے مخصوص تھے، ہر روز توسیعی خطبات کا سلسلہ بھی رہا، یہ خطبے مسز قمر آستاں (پاکستان) جناب مجیب الرحمن (بنگلہ دیش)

پروفیسر علی محمد خسرو (حیدرآباد) اور پروفیسر مقبول احمد (علی گڑھ) نے دیئے، پروفیسر خسرو کا خطبہ بہت پسند کیا گیا۔

یہ سیمینار بین الاقوامی تھا، کویت سے عبداللہ یوسف غنیم (ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف عربک منسکرپٹ) دبئی سے ڈاکٹر یوسف الحاج جمعیۃ الماجد انسٹی ٹیوٹ) اور مسز عفاف الحافظ، پاکستان سے جناب مسعود احمد برکاتی (ڈائرکٹر پبلیکیشنز ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی) حکیم نعیم الدین زبیری (ڈائرکٹر ریسرچ ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی) اور پروفیسر قدرت اللہ فاطمی (اسلام آباد) اور بنگلہ دیش سے جناب مجیب الرحمٰن (راج شاہی یونیورسٹی) تشریف لائے تھے، ہندوستان میں دہلی، حیدرآباد، بھوپال، مدراس اور بنارس کے علاوہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے متعدد پروفیسر صاحبان رونق افروز تھے، طبقۂ علماء میں مولانا عبدالسلام خان (سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ رام پور) مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی (سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ) مولانا حکیم عبدالقوی دریابادی (مدیر صدق جدید لکھنؤ) مفتی ظفیر الدین مفتاحی (دارالعلوم دیوبند) مولانا برہان الدین سنبھلی (دارالعلوم ندوۃ العلماء) اور مولانا شاہ محمد اسماعیل (پٹنہ) شریک تھے، دارالمصنفین سے راقم کے علاوہ مولوی حافظ عمیر الصدیق دریابادی اور مولوی عبدالمبین ندوی نے شرکت کی تھی۔

سیمینار میں مختلف تفسیری مخطوطات پر بیش قیمت مقالے پیش کیے گئے، مولانا آزاد کے علاوہ دور حاضر کے جدید مفسرین میں مولانا حمید الدین فراہیؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی تفسیروں پر بھی سیر حاصل مضامین پڑھے گئے، جن پر خوب بحث و مباحثہ بھی ہوا، ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی جد و جہد سے سیمینار کے تمام پروگرام خیر و خوبی سے انجام پاتے رہے، جناب شعائر اللہ خان، جناب سلیم الدین احمد اور مولوی عتیق الرحمٰن قاسمی اور لائبریری کے دوسرے کارکن ہر وقت مستعد دکھائی دیتے، اور جناب متین ابدالی پانچ چھ روز تک مہمانوں کے کام و دہن کو لذت بہم پہنچاتے رہے۔

مقالات

مدینہ میں تدوین سیر و مغازی

(پہلی صدی کے نصف آخر میں)

از

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، سابق اڈیٹر البلاغ، بمبئی

قدماء کے نزدیک مغازی کا مفہوم بہت وسیع و جامع اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے، جن میں غزوات و سرایا بھی شامل ہیں۔ بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ اور بنائے کعبہ سے لیکر خلفائے راشدین کے دور کے بعض احوال تک شامل ہیں، جیسا کہ اس دور کی کتابوں سے ہے، اسی وسیع مفہوم کی وجہ سے قدماء کی کتابیں کتاب المغازی کے نام سے یاد کی گئیں، حالانکہ ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کا بیان ہے جس کا ایک حصہ غزوات و سرایا پر مشتمل ہے،

البتہ بعد کے مصنفین کی کتابیں عام طور سے سیرت کے نام سے مشہور ہیں، ان کے نام کچھ اور ہوتے ہیں مگر اپنے مصنفین کی نسبت سے مشہور ہیں، جیسے سیرت ابن ہشام، سیرت حلبیہ اور سیرت مغلطائی وغیرہ

مدرسۃ المغازی مدینہ منورہ | جن اسلامی علوم و فنون کی تدوین کی ابتدا مدینہ منورہ میں ہوئی ان میں اولیت علم سیر و مغازی کو حاصل ہے، جس کا تعلق علم حدیث سے ہے، یہیں جہاد فرض ہوا، یہیں

غزوات و سرایا کی مہمات روانہ ہوتی تھیں اور یہیں واپس آتی تھیں، امام مالکؒ کا قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلاں فلاں غزوات سے اتنے اتنے ہزار صحابہ کو لے کر واپس آئے تھے، ان میں تقریباً دس ہزار مدینہ منورہ میں رہکر یہیں فوت ہوئے، باقی حضرات دوسرے شہروں میں چلے گئے، ایک محدث عبداللہ بن عبدالکریم کا بیان ہے کہ وصال نبویؐ کے وقت بیس ہزار آنکھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے والی موجود تھیں [1]،

صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ غزوۂ تبوک میں اس قدر زیادہ صحابہ شریک تھے کہ ان کے نام دفتر میں نہیں سما سکتے تھے [2]، ابن سعد نے لکھا ہے کہ غزوۂ تبوک آخری غزوہ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں شرکا کی تعداد تیس ہزار تھی [3]،

ابوزرعہ رازی کا قول ہے کہ صحابہ کا شمار کون کر سکتا ہے؟ وصال نبویؐ کے وقت ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ موجود تھے، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، ایک روایت میں ہے کہ وصال نبویؐ کے وقت مدینہ منورہ میں تیس ہزار صحابہؓ موجود تھے اور تیس ہزار مختلف قبائل و مقامات میں چلے گئے تھے [4]، ان ہی حضرات نے حدیث اور سیر و مغازی کی روایت کر کے غزوات و سرایا کی ایک ایک کیفیت بلا کم و کاست اپنے معاصر صحابہ و تابعین سے بیان کی،

اسی لیے علماء نے مدینہ منورہ کو علم المغازی کا مرکز و مدرسہ قرار دیا ہے، امام سفیان ابن عیینہ کا قول ہے

من اراد المغازی فالمدینۃ ومن اراد المناسک فمکۃ، ومن اراد الفقہ فالکوفۃ، ویلزم اصحاب ابی حنیفۃ [1]

جو مغازی حاصل کرنا چاہے اس کے لیے مدینہ ہے اور جو مناسک سیکھنا چاہے اس کے لیے مکہ ہے اور جو فقہ کی تعلیم حاصل کرنا چاہے اس کے لیے کوفہ ہے اور ابوحنیفہ کے تلامذہ کو اختیار کرے۔

۱؎ ترتیب المدارک، قاضی عیاض ج ۱ ص ۶۷ (بیروت) ۲؎ بخاری کتاب المغازی، غزوۂ تبوک ۳؎ طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۲۲۳ ۴؎ الکفایہ ص ۴۰۳ و تدریب الراوی ص ۴۰۶

یہیں سے فن مغازی کی تدوین کی ابتدا ہوئی اور دوسرے شہروں کے علماء مغازی اور مصنفین کا سلسلہ یہیں کے علماء و رواۃ سے ملتا ہے،

پہلی صدی کے نصف آخر میں تدوین سیر و مغازی کی ابتداء

چنانچہ یہیں کے تین ہمعصر، ہم ذوق اور ہم وطن علماء نے پہلی صدی کے نصف آخر میں سیر و مغازی کو کتابی شکل میں مدون کیا، عروہ ابن زبیر متوفی ۹۴ھ، ابان بن عثمان متوفی ۱۰۵ھ اور محمد بن شہاب متوفی ۱۲۴ھ رحمہم اللہ

جس زمانہ میں اسلامی علوم و فنون کے بارے میں تحقیق و تلاش جاری تھی اور احادیث و آثار اور سیر و مغازی کی تحدیث و روایت ہو رہی تھی، عین اسی زمانہ میں حضرت معاویہؓ متوفی ۵۹ھ نے عبید بن شریہ جرہمی کو یمن کے شہر صنعاء سے دمشق بلا کر کتاب الملوک و اخبار الماضیین لکھوائی جس کا انداز افسانوی تھا، اور سوال و جواب کی صورت میں ملوک حمیر اور گذشتہ قوموں کے واقعات تھے، نیز عبید بن شریہ نے ایک اور کتاب الامثال لکھی تھی، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا تھا مگر لقاء نہ ہو سکا، عبید بن شریہ اسکے بعد کم و بیش پچیس سال تک بقید حیات رہے اور عبدالملک بن مروان کے دور خلافت میں فوت ہوئے [2]

ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ کی خصوصی توجہ سے لکھی جانے والی کتاب الملوک و اخبار الماضیین

۱؎ اخبار ابی حنیفۃ و اصحابہ، صیمری ص ۷۵ ۲؎ الفہرست ابن ندیم ص ۱۳۲،

عوام و خواص میں مقبولیت حاصل ہوئی، خاص طور سے یمن کے قحطانی عربوں نے حجاز کے عدنانی عربوں کے سامنے اس کتاب کو آبائی مفاخر و محاسن کے طور پر پیش کیا، سیر و مغازی کی تدوین کے دواعی و محرکات میں یہ صورت حال بھی شامل رہی اور مدینہ منورہ میں عروہ ابن زبیر، ابان بن عثمان اور محمد بن شہاب نے اور عبید بن شریہ کے وطن صنعاء میں وہب بن منبہ نے ایک ہی زمانہ میں یعنی پہلی صدی کے نصف ثانی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور غزوات پر کتابیں تصنیف کیں، ان مصنفینِ سیر و مغازی کے سامنے وہ احادیث اور واقعات بھی تھے جن میں یہود و نصاریٰ اور دوسری اقوام و ملل کے قصوں کہانیوں سے شدت سے روکا گیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر سخت نکیر فرما کر مسلمانوں کو ذہنی و فکری ابتلاء سے بچایا تھا، اور جب ان حضرات نے لوگوں کا رجحان غیروں کیطرف دیکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سیر و مغازی کو مدوّن کیا اور ان کی کتابیں عوام و خواص میں یوں مقبول و متداول ہوئیں کہ ان کی توجہ لایعنی اور بے مقصد قصے کہانی کی کتابوں سے ہٹ کر سیر و مغازی کی کتابوں کی طرف مبذول ہو گئی، محمد بن اسحاق کے متعلق محدث ابن عدی کا قول ہے کہ اگر ان کا صرف یہی ایک کارنامہ ہوتا کہ انھوں نے امراء و سلاطین کی توجہ غیر مقصدی کتابوں سے ہٹا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مغازی کی طرف مبذول کر دی تو انکی فضیلت کے لیے کافی تھا،[1] ایک اور بزرگ علی بن محمد خراسانی کا قول ہے کہ خلیفہ ابو جعفر منصور نے نجومیوں کو دربار میں جگہ دی اور سریانی و عجمی زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کرائے جن کو پڑھ کر لوگ فریفتہ ہو گئے، یہ دیکھ کر محمد بن اسحاق نے کتاب المغازی لکھی ہے[2]

مغازی کی تدوین و تصنیف کسی خلیفہ یا امیر کے حکم سے نہیں ہوئی۔

یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ مدینہ منورہ میں عروہ بن زبیر

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴ [2] تاریخ الخلفاء ص ۲۲۶،

ابان بن عثمان، محمد بن شہاب اور صنعاء میں وہب بن منبہ نے اپنی صوابدید اور احوال و ظروف کے پیشِ نظر اپنی اپنی کتاب المغازی لکھی، اس میں کسی خلیفہ یا امیر کے حکم یا خواہش کو کوئی دخل نہیں تھا، یہ ضرور ہے کہ خلیفہ عبد الملک بن مروان نے عروہ بن زبیر سے غزوۂ بدر اور فتح مکہ کے بارے میں تحریری تفصیل حاصل کی جیسا کہ تاریخ طبری میں ہے اور اس کے صاحبزادے سلیمان بن عبد الملک نے ابان بن عثمان سے مغازی پر کتاب لکھنے کی خواہش کی، مگر ان دونوں خلیفہ اور خلیفہ زادے سے پہلے عروہ بن زبیر اور ابان بن عثمان اپنی کتاب المغازی مدوّن و مرتب کر چکے تھے، عروہ بن زبیر کی تمام کتابیں جن میں کتاب المغازی بھی تھی ۶۳ھ میں واقعۂ حرہ میں نذر آتش ہو گئی تھیں، جس کا افسوس ان کو زندگی بھر رہا اور ابان بن عثمان نے سلیمان بن عبد الملک کی خواہش پر بتایا کہ انھوں نے پہلے ہی نہایت مستند طریقہ کتاب المغازی مدوّن کر لی ہے، ان باتوں کی تفصیل آگے آئے گی، محمد بن شہاب نے بھی اپنے دونوں معاصر مصنفین مغازی کے زمانہ میں کتاب المغازی لکھی، ہو سکتا ہے کہ انھوں نے حضرت عمرؓ بن عبد العزیز (۹۹ھ تا ۱۰۱ھ) کے دورِ خلافت میں اس کو مدون کیا، جب کہ حضرت عمرؓ بن عبد العزیز نے ان کو خاص طور سے احادیث جمع کرنے کا حکم دیا تھا، صنعاء میں وہب ابن منبہ متوفی ۱۱۰ھ نے بھی اسی دور میں کتاب المغازی تصنیف کی تھی،

ابتدائی کتب مغازی کی روایات

یہ کتابیں ایسے دور میں لکھی گئیں جس میں باقاعدہ تصنیف و تدوین کا رواج نہیں تھا، صحابہ اور تابعین کے پاس احادیث کے صحیفے اور نسخے غیر مرتب شکل میں موجود تھے، پہلی صدی کی انتہاء اور دوسری صدی کی ابتداء میں عمرؓ بن عبد العزیز کے حکم سے احادیث و آثار جمع کیے گئے اور دوسری صدی کے نصف میں فقہی ترتیب و تبویب پر عالم اسلام کے مرکزی شہروں میں کتابیں لکھی گئیں اور باقاعدہ

تصنیف وتالیف کا دور شروع ہوا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے مدینہ منورہ میں علم المغازی پر کتابیں لکھی گئیں اور اس بارے میں انواع حدیث کی اس نوع کو اولیت کا درجہ حاصل ہے،

یہ کتابیں اپنی اصلی شکل میں باقی نہ رہ سکیں، البتہ ان کی روایتیں حدیث اور سیر ومغازی کی کتابوں میں آگئی ہیں، عروہ بن زبیر کی کتاب المغازی سنہ ۶۳ھ میں واقعہ حرّہ میں نذر آتش ہوگئی اور ان کے تلامذہ میں ابوالاسود یتیم عروہ نے آخر عمر میں مصر جاکر اس کی روایت کی، نیز دوسرے تلامذہ کے ذریعہ اس کی بہت سی روایات محفوظ ہیں اور ابوالاسود کی روایت کا معتد بہ حصہ سنہ ۱۳۰۱ھ میں چھپ گیا ہے،

ابان بن عثمان کی کتاب المغازی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عتاب کی وجہ سے ضایع کردی گئی اور اس کی روایت عام طور سے نہ ہوسکی، صرف انکے تلمیذ مغیرہ بن عبدالرحمٰن نے جرأت کرکے اس کی روایت کی اور اپنے شاگردوں کو اس کے پڑھنے پڑھانے کی تاکید کی، کتب مغازی میں ابان بن عثمان کی گنی چنی چند روایتیں ملتی ہیں اور تتبع وتحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی کئی روایتیں ان کے نام کے بغیر بیان کی گئی ہیں،

محمد بن شہاب زہری کی کتاب المغازی کا اکثر وبیشتر حصہ ان کے تلامذہ نے اپنی کتابوں میں لے لیا ہے، خاص طور سے موسیٰ بن عقبہ، محمد بن اسحاق اور معمر بن راشد اپنے استاذ کی روایات کے امین ہیں، نیز دوسرے علمائے سیر ومغازی نے اپنی کتابوں میں زہری کی روایات کثرت سے لی ہیں اور معمر بن راشد کی روایات مصنف عبدالرزاق کی کتاب المغازی میں اس کثرت سے ہیں کہ وہ گویا زہری کی کتاب المغازی ہے، ان باتوں کی تفصیل آیندہ آرہی ہے،

تیسری صدی اسلامی علوم وفنون کے شباب کا دور ہے اور اس صدی کے خاتمہ تک علمائے اسلام نے جس موضوع پر جو کچھ لکھدیا وہی بعد کے علماء ومصنفین کا سرمایۂ علم وفن ٹھہرا، یہ ضرور ہوا کہ بعد میں ان میں تہذیب وتنقیح اور تحقیق کے نئے نئے زاویے پیدا ہوئے اور اجمال کی تفصیل کی گئی مگر اس کا محور تیسری صدی تک کی تصانیف ہی تھیں، یہی حال سیر ومغازی کا ہے کہ اس زمانہ تک یہ فن تصنیفی لحاظ سے مکمل ہوگیا تھا، اس دور تک کتب سیر ومغازی کا ماخذ ومنبع پہلی اور دوسری صدی کی کتابیں تھیں، اس کے بعد علماء نے اپنے اپنے ذوق ووجدان اور احوال وظروف کے مطابق اس فن میں کتابیں لکھیں، جن میں بہت سی روایات قابلِ نقد ونظر شامل ہوگئیں،

مدینہ میں تدوین مغازی کے دو دور

مدینہ منورہ میں مغازی کی تصنیف ومصنفین کے دو دور ہیں، پہلا دور پہلی صدی کے نصف ثانی سے اس کے خاتمہ تک ہے جو اسلام میں باقاعدہ تصنیف وتالیف سے قبل تھا، اس میں مغازی کے مصنفین فقہائے مدینہ تھے جو خالص حدیث، فقہ وفتویٰ اور دینی علوم کے حامل تھے، جن میں علم مغازی بھی ہے، اس دور کے مصنفین مغازی نے مدینہ میں رہ کر کتابیں لکھیں، دوسرا دور دوسری صدی سے شروع ہوتا ہے، اس میں تصنیف وتالیف کا باقاعدہ رواج ہوا، علٰحدہ علٰحدہ موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں اور پہلے دور کے مقابلہ میں کتابوں میں تنقیح وتہذیب زیادہ ہوئی اور مختلف علوم وفنون کے مصنفین مختلف القاب سے یاد کیے گئے، اسی دور میں محدث، فقیہ، مفسر، مورخ، اخباری، صاحب المغازی، نساب، عالم الاخبار والاحداث وغیرہ کے امتیازی نام کا رواج ہوا، اس دور کے مصنفین مغازی نے مدینہ کے باہر بغداد وغیرہ میں رہ کر کتابیں لکھیں،

دور اول کے مصنفین اور راویان سیر ومغازی

اس دور میں بعض اکابر صحابہ اور بہت سے اصاغر صحابہ اور ان سے

روایت کرنے والے اکابر تابعین کی بہت بڑی جماعت موجود تھی اور یہ سب کے سب ثقہ، عادل اور مامون راوی تھے، ان میں کسی قسم کا ضعف نہیں تھا، اکابر صحابہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ غزوات و سرایا میں شریک رہے ہیں، جن کے بارے میں تصریح ہے کہ وہ تمام غزوات و مشاہد میں آپؐ کے ہمرکاب رہے، ان میں سے اکثر وصال نبویؐ سے پہلے یا بعد میں دنیا سے گذر گئے، اس لیے ان سے احادیث اور سیر و مغازی کی روایت نہ کی جاسکی، اس وقت تک نہ اس کی ضرورت تھی اور نہ اس کا رواج تھا اور ان میں سے جو حضرات زندہ رہے ان سے بہت کم احادیث اور واقعات مروی ہیں، نیز خلفائے راشدین خاص طور سے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ احادیث کی روایت میں شدت اور احتیاط سے کام لیتے تھے اور بحق قرآن احادیث کی اشاعت سے روکتے تھے، اس لیے اکابر صحابہ سے بہت کم روایت کیجا سکی، چنانچہ خلفائے اربعہ، طلحہ، زبیر بن عوام، سعد بن ابی وقاصؓ، عبادہ بن صامت، اسید بن حضیر، معاذ بن جبل اور دیگر اجلہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایت کے مقابلہ میں اصاغر صحابہ کی روایات زیادہ ہیں، جیسے جابر بن عبد اللہ، ابو سعید خدری، ابو ہریرہ، عبد اللہ بن عمر بن خطاب، عبد اللہ بن عمرو بن عاص، عبد اللہ بن مسعود، عبد اللہ ابن عباس، رافع بن خدیج، انس بن مالک، براء بن عازب رضی اللہ عنہم اور دوسرے متاخر الوفاۃ اصاغر صحابہ جو علماء و فقہاء، اور اہل فتویٰ میں شمار ہوتے ہیں،

ان کے بعد اصاغر صحابہ میں عقبہ بن عامر جہنی، زید بن خالد جہنی، عمران بن حصین، نعمان بن بشیر، معاویہ بن ابو سفیان، سہل بن سعد ساعدی، عبد اللہ بن یزید خطمی، مسلمہ بن مخلد زرقی، ربیعہ بن کعب اسلمی، ہند بن حارثہ اسلمی، اسماء بن حارثہ اسلمی رضی اللہ عنہم وغیرہ احادیث و آثار اور سیر و مغازی کی تدوین کے ابتدائی زمانہ تک زندہ رہے اور ان سے بہت سی

روایات منقول ہیں، ان ہی متقدم الوفاۃ اور متاخر الوفاۃ صحابہ کی روایتوں کو مدون و مرتب کیا گیا، ان میں سے بعض صحابہ نے شدت احتیاط، عبادت و ریاضت اور جہاد و اسفار کی وجہ سے بہت کم روایت کی اور بہت سے صحابہ اپنے قبیلہ اور بستی سے آکر جہاد میں شریک ہوئے اور ادھر ہی سے واپس چلے گئے اور کچھ صحابہ خدمت نبوی میں حاضری کے بعد اپنے قبیلہ میں چلے گئے۔ ان سب حضرات سے روایت نہیں ہو سکی، یا ہوئی تو بہت کم،

صحابہ کے بعد ان کے تلامذہ یعنی تابعین کا دور ہے جنھوں نے احادیث و آثار اور سیر و مغازی کے واقعات اپنے شیوخ و اساتذہ اور خاندانی بزرگوں سے سن کر بیان کیے، اس طبقہ میں انصار و مہاجرین اور دوسرے صحابہ کی اولاد میں علم زیادہ رہا، ان کے بعد تبع تابعین کا زمانہ آیا جنھوں نے صحابہ اور تابعین کے علم کو آگے بڑھایا،

سیرت اور سیر و مغازی کا تمامتر سرمایہ ان ہی صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی روایتوں سے جمع کیا گیا ہے[1]

کتاب المغازی
عروہ بن زبیر اسدی مدنی

مدینہ منورہ کے تین ہمعصر مصنفینِ مغازی کے بارے میں یہ معلوم نہیں کس نے سب سے پہلے کتاب لکھی، اتنا معلوم ہے کہ عروہ بن زبیر اور ابان بن عثمان نے سب سے پہلے مغازی پر کتاب لکھی اور ان کے بعد محمد بن شہاب زہری نے لکھی، بعض قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عروہ بن زبیر کو اس بارے میں اولیت حاصل ہے، ابن کثیر نے واقدی کا قول نقل کیا ہے،

كان عالماً مامونا ثبتاً حجةً، عالماً بالسير واول من صنف المغازي[2]	عروہ بن زبیر عالم، مامون، ثبت حجت سیر کے عالم اور انھوں نے سب سے پہلے مغازی تصنیف کی ہے۔

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۳۷۶ تا ۳۸۰ [2] البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۱۰۱

اور حلبی نے لکھا ہے

ویقال اول من صنف فیھا عروۃ	کہا جاتا ہے کہ مغازی میں سب سے پہلے عروہ
بن الزبیر[1]	ابن زبیر نے کتاب لکھی ہے،

ابو عبد اللہ عروہ بن الزبیر بن عوام بن خویلد بن اسد اسدی قرشی مدنی متوفی ۹۴ھ رحمۃ اللہ علیہ کے والد حضرت زبیر بن عوام حواری رسول، عشرہ مبشرہ اور اصحاب شوریٰ میں سے ہیں، ان کی والدہ حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیقؓ ہیں، حضرت عمرؓ کے آخری دور خلافت میں پیدا ہوئے، ان کا گھرانا ابتدائے اسلام سے مجد و شرف، علم و فضل، دین و دیانت اور ریاست و سیادت میں ممتاز و مشہور تھا اور آگے چل کر آل زبیر میں نامی گرامی امراء و حکام، محدثین و فقہاء، مورخین و نسابین، اعیان واشراف، اجواد و اسخیاء اور اہل فضل و کمال پیدا ہوئے،

عروہ بن زبیر نے بہت سے صحابہ اور صحابیات سے حدیث کی روایت کی اور تفقہ کی تعلیم اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے حاصل کی اور فقہ و فتویٰ میں حضرت زید بن ثابتؓ کے بارہ مخصوص تلامذہ میں سے تھے جنھوں نے براہ راست ان سے تفقہ و اجتہاد میں اکتساب فیض کرکے اسکی تعلیم دی[2]

ان کا ایک مستقل مدرسہ "کتاب عروہ" کے نام سے مصلی (مسجد غمامہ) کے قریب حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عمار بن یاسرؓ کے مکان کے قریب تھا اور اسی کے پاس مسجد بنی زریق بھی تھی[3]، وہ اسی مدرسہ میں تعلیم دیتے تھے،

صاحبزادے ہشام بن عروہ کا بیان ہے کہ والد مجھے، عبد اللہ بن عروہ، عثمان، اسمٰعیل اور میرے دوسرے بھائیوں کو بلا کر کہا کرتے تھے کہ تم لوگ طالبعلموں کے ساتھ میرے سامنے بھیڑ

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۳ [2] کتاب العلل و معرفۃ الرجال، ابن مدینی ص ۹۹ تا ۱۰۵ [3] وفاء الوفاء ج ۳ ص ۹۳،

نہ لگاؤ، جب میں تنہا رہوں تو آکر مجھ سے سوالات کرو اور ہم لوگ جاتے تو حدیث بیان کرتے، اور علٰحدہ علٰحدہ باب اور عنوان سے طلاق، پھر خلع، پھر حج، پھر ہدی اور اسی طرح دوسرے امور کی تعلیم دیتے تھے، آخر میں ہم سب سے سبق سنتے تھے اور میرے یاد کرنے پر خوش ہوتے تھے، واللہ ہم نے ان سے ان کی احادیث کا ایک حصہ بھی نہیں سُنا،[1]

عروہ بن زبیر کی ملکیت میں وادی عقیق میں قصر عروہ اور بیر عروہ کے علاوہ شاندار باغات اور نخلستان تھے، انھوں نے اپنے دور کے فتنوں سے دور رہ کر زہد و تقویٰ کی زندگی بسر کی، یزید بن معاویہ کے دور میں ان کے بھائی حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے مکہ مکرمہ میں اپنی خلافت کا اعلان کیا اور ۷۳ھ میں عبد الملک بن مروان کے دور میں ان کی شہادت ہوئی، ۶۳ھ میں مدینہ منورہ میں واقعۂ حرہ پیش آیا، جس میں شامی فوجوں نے بے دریغ کشت و خون اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ اس سے پہلے ۶۱ھ میں حادثۂ کربلا پیش آیا، مگر ان حوادث و فتن میں ان کا نام تک نظر نہیں آتا ہے،

وہ فقہ و فتویٰ کے امام تھے، اسی کے ساتھ مغازی کے مشہور عالم و مصنف تھے، غزوات و سرایا کے واقعات اپنی خالہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور والد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے سنتے تھے، جہاد میں ان کو جو زخم آئے تھے، ان کے گہرے نشان سے بچپن میں کھیلا کرتے تھے ان کے اساتذہ میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ مغازی کے عالم و معلم تھے اور اسکی تعلیم کے لیے باقاعدہ مجلس درس منعقد کیا کرتے تھے،

انھوں نے فقہ و فتویٰ اور حدیث کی تعلیم و روایت کے ساتھ بہت سی کتابیں بھی تصنیف کی تھیں، جن کو حادثۂ حرہ میں خود جلا دیا، یا جلا دیا گیا، صاحبزادے ہشام بن

[1] تاریخ کبیر ج ۴ قسم ۱ ص ۳۲ و جامع بیان العلم ج ۱ ص ۱۱۷،

عروہ کا بیان ہے

احرق ابی یوم الحرۃ کتب	میرے والد واقعۂ حرہ میں اپنی فقہ کی
فقہ کانت لہ قال: فکان	کتابیں جلا دیں، اس کے بعد کہا کرتے
یقول بعد ذلک: لان تکون	تھے کہ ان کتابوں کا میرے پاس موجود
عندی احب الی من ان	ہونا اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میرے اہل
یکون لی مثل اھلی ومالی[1]	وعیال اور اموال میرے پاس ہوں،

اور ان ہی سے دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

انہ احترقت کتبہ یوم الحرۃ،	ان کی کتابیں واقعۂ حرہ میں نذر آتش
وکان یقول: وددت لو ان	ہو گئیں، بعد میں کہا کرتے تھے کہ اے
عندی کتبی باھلی ومالی[2]	کاش! میرے اہل و مال کے بدلے وہ
	کتابیں میرے پاس ہوتیں،

واقعۂ حرہ کے وقت عروہ بن زبیر کی عمر تقریباً چالیس سال کی تھی، اس مدت میں انھوں نے جو کتابیں لکھیں یا جمع کیں ان میں کتاب المغازی بھی رہی ہو گی جس کی تدوین ۶۳ھ سے پہلے ہو چکی تھی اور اس کی خبر عبد الملک بن مروان کو تھی، اسی لیے اس نے ۶۵ھ میں خلیفہ ہونے کے بعد عروہ بن زبیر سے فتح مکہ اور غزوۂ بدر کے بارے میں تفصیل معلوم کی اور انھوں نے ان دونوں سوالوں کے جواب میں طول طویل تحریر روانہ کی، جیسا کہ تاریخ طبری میں ہے،

کتاب المغازی کی ترویج و اشاعت اس زمانہ کے مطابق روایت کے ذریعہ ہو گئی تھی، اور ان کے کئی تلامذہ نے ان سے اس کی روایت کی اور ان کے خویش اور پروردہ ابو الاسود

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۱۷۹ [2] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۵

محمد بن عبد الرحمٰن جو یتیم عروہ کی نسبت سے مشہور ہیں اس کتب کے خاص راوی و معلم ہیں، ان کے علاوہ محمد بن شہاب زہری اور سعد بن ابراہیم بن عبد الرحمٰن بن عوف نے ان سے مغازی کی روایت کی ہے جو خود مغازی کے مصنف ہیں، ابو الاسود یتیم عروہ کے بارے میں ذہبیؒ نے تصریح کی ہے،

نزل ابو الاسود مصر، وحدث	ابو الاسود نے مصر جا کر عروہ بن زبیر کی
بھا بکتاب المغازی لعروۃ	کتاب المغازی کی روایت کی جس کی روایت
بن الزبیر، عنہ[1]	ان سے کی تھی،

اس طرح کتاب المغازی ضائع ہو جانے کے باوجود ابو الاسود وغیرہ کی روایت سے عام ہوئی اور علماء و محدثین نے اس کو مستند قرار دے کر اس سے اخذ و اقتباس اور استشہاد کیا، حافظ ابن حجر نے فتح الباری، کتاب المغازی میں جا بجا اس کی روایات بیان کی ہیں مثلاً

وکذلک اخرجہ ابو الاسود فی المغازی عن عروۃ، وکذلک ذکرہ موسیٰ بن عقبۃ عن ابن شہاب، وابو الاسود عن عروۃ، وفی المغازی لابی الاسود عن عروۃ، وفی مغازی ابی الاسود عن عروۃ، وعند ابی الاسود عن عروۃ، وذکر ابو الاسود فی مغازیہ عن عروۃ، وعند ابی الاسود فی المغازی عن عروۃ،[2]

ان اقتباسات میں کتاب المغازی کی نسبت ابو الاسود یتیم عروہ کی طرف ہے جو در حقیقت عروہ بن زبیر کی کتاب المغازی ہے، ابو الاسود نے قدماء کے طریقہ پر اس کتاب کی عروہ

---

[1] سیر اعلام النبلاء / بحوالہ مغازی الرسول عروہ بن زبیر [2] فتح الباری، کتاب المغازی ج ۷، ص ۲۴۲، ۵۰۲ و ص ۵۵۳ و ص ۵۰۹ و ۵۱۰ ص ۵۱۳ و ص ۲۷۶ و ص ۲۸۰ و ص ۲۷۶ طبع سلفیہ مصر،

ابن زبیر سے روایت کرکے اس میں اپنے دیگر طرق و اسناد سے روایتیں بیان کیں اور اس کی حیثیت مستقل کتاب کی ہوگئی۔ جیسے امام مالکؒ کی کتاب الموطا کے متعدد نسخے پائے جاتے ہیں اور اپنے اپنے مرتبین کے نام سے مشہور ہیں کیونکہ ان کے تلامذہ نے ان کی کتاب الموطا میں دوسرے طرق سے بھی حدیثیں جمع کیں،

ابن ندیم نے ابوحسان حسن بن عثمان زیادی متوفی سنہ ۲۴۳ھ کی تصانیف میں عروہ ابن زبیر کی کتاب المغازی کا نام لیا ہے

ولہ من الکتب، کتاب مغازی	ان کی کتابوں میں عروہ بن زبیر کی
عروۃ ابن الزبیر[1]	کتاب المغازی ہے،

ابوحسان زیادی بغداد کے قاضی اور واقدی کے تلامذۂ کبار میں سے ہیں ان کی تصانیف میں مغازی عروہ بن زبیر کا شمار اسی اعتبار سے ہے کہ انھوں نے بھی اس کتاب میں حک و اضافہ کرکے مستقل کتاب مدون کرلی تھی،

ہمارے دیار کے معاصر عالم ڈاکٹر محمد مصطفےٰ اعظمی نے سنہ ۱۴۰۱ھ میں "مغازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعروۃ الزبیر، بروایۃ ابی الاسود یتیم عروۃ" کے نام سے ایک کتاب احادیث و تواریخ اور سیر و مغازی کی کتابوں سے مرتب کرکے شایع کی ہے، جس میں عروہ بن زبیر کی کتاب المغازی کا معتدبہ حصہ آگیا ہے۔

کتاب المغازی
ابان بن عثمان اموی مدنیؒ

مدینہ منورہ کے علمائے سیر و مغازی میں ابوسعید ابان بن عثمان ابن عفان اموی قرشی مدنی متوفی سنہ ۱۰۵ھ رحمۃ اللہ علیہ ابتدائی

---

[1] الفہرست ص ۱۶۰، مصری نسخہ میں کتابت یا طباعت کی غلطی کیوجہ سے "معانی عروۃ بن الزبیر" ہے، مطبوعہ یورپ میں "مغازی عروۃ بن الزبیر" ہے اور یہی صحیح ہے،

مصنف ہیں، یہ معلوم نہیں کہ عروہ بن زبیر اور ابان بن عثمان میں کس نے پہلے کتاب المغازی لکھی، ایک اندازہ کے مطابق ان کی پیدائش سنہ ۲۰ھ کے حدود میں ہوئی، مدینہ کے اہلِ فقہ و فتویٰ میں ان کا بھی شمار تھا، حضرت زید بن ثابتؓ ان کے شیخ الکل فی الکل تھے اور یہ ان ہی کے فقہی و اجتہادی مسلک کے ترجمان تھے، حضرت زید بن ثابتؓ کے بارہ مخصوص تلامذہ جو ان کے فقہی مسلک کے ترجمان و ناشر ہیں ان میں ابان بن عثمان بھی ہیں،[1]

نیز انھوں نے اپنے والد عثمان بن عفانؓ اور اسامہ بن زید بن حارثہؓ وغیرہ سے حدیث کی روایت کی ہے ان کے تلامذہ کی تعداد زیادہ ہے، ان میں محمد بن شہاب زہری اور مغیرہ بن عبدالرحمٰن زیادہ مشہور ہیں، زہری کتاب المغازی کے مصنف اور مغیرہ ان کی کتاب المغازی کے راوی و ناشر ہیں،

ابان بن عثمان نے سنہ ۸۲ھ سے پہلے کتاب المغازی لکھی تھی، مگر ایک خاص واقعہ کی وجہ سے اس کی روایت و اشاعت بہت محدود طریقہ پر ہوئی۔

اس کی تفصیل زبیر بن بکار متوفی سنہ ۲۵۶ھ نے کتاب "الموفقیات فی الاخبار" میں یوں بیان کی ہے کہ سنہ ۸۲ھ میں سلیمان بن عبدالملک بن مروان حج و زیارت کے سلسلہ میں مدینہ منورہ حاضر ہوا، یہ اس کی ولی عہدی کا زمانہ تھا، مدینہ کے اعیان و اشراف سلام و استقبال کے لیے نکلے، سلیمان بن عبدالملک نے ابان بن عثمان، ان کے بھائی عمرو بن عثمان اور ابوبکر بن عبداللہ بن ابواحمد کے ساتھ مدینہ منورہ کے متبرک مقامات و مشاہد کی زیارت کی، جن جگہوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی یا صحابہ شہید ہوئے تھے سب کو دیکھا، اسی سلسلہ میں جبل احد، مسجد فضیخ، مشربۂ ام ابراہیم کی

---

[1] کتاب العلل و معرفۃ الرجال، ابن مدینی ص ۴۹ تا ۵۱،

زیارت کرتا ہوا قبا تک گیا، ہر مقام و مشہد کے بارے میں مذکورۂ بالا اہل علم سے معلومات حاصل کرتا رہا اور یہ حضرات اس کو تفصیلات بتلاتے رہے، قبا پہنچ کر اس نے ابان بن عثمان سے کہا کہ آپ میرے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور مغازی کتابی شکل میں مرتب کر دیں، ابان بن عثمان نے کہا کہ میں پہلے ہی ان کو اپنے موثق و معتبر راویوں کے ذریعہ صحیح طور سے جمع کر چکا ہوں، اس کے بعد سلیمان بن عبد الملک نے اس کتاب کو نقل کرنے کا حکم دیا، بلکہ دس کاتبوں کو مقرر کر کے کتاب ان کے حوالہ کر دی اور انھوں نے اس کو چمڑے کے ورق میں نقل کیا، زبیر بن بکّار کا بیان ہے

ثم امر ابان بن عثمان ان	پھر سلیمان بن عبد الملک نے ابان بن
یکتب له سیرة النبی صلی الله	عثمان کو حکم دیا کہ وہ اسکے لیے رسول اللہ
علیه وسلم ومغازیه، فقال	صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور مغازی لکھیں
ابان: قد اخذ تها مصحّحة	ابان نے کہا کہ میں نے معتبر راویوں سے انکو
ممن اثق به، فامر بنسخها	صحیح طور سے لکھ لیا ہے تو سلیمان نے ان کے
والقیٰ فیها (الیٰ) عشرة من	لکھنے کا حکم دیا اور ان کو دس کاتبوں کے
الکتاب فکتبوها فی رق ه	حوالہ کیا، جنھوں نے ان کو کھال پر لکھا،

جب کتاب سلیمان بن عبد الملک کے ہاتھ میں پہونچی اور اس نے اس میں عقبۂ اولیٰ اور عقبۂ ثانیہ اور غزوۂ بدر میں انصار کا تذکرہ دیکھا تو کہنے لگا کہ میں ان لوگوں کو ان فضائل کا مستحق نہیں سمجھتا ہوں، ان کے بارے میں میرے خاندان نے چشم پوشی اور بے اعتنائی سے کام لیا ہے، یا یہ لوگ ایسے نہیں تھے اور ان کے بارے میں غلط فہمی ہے، یہ سن کر ابان بن عثمان نے کہا کہ امیر! انصار نے شہید مظلوم (حضرت عثمانؓ) کے ساتھ

جو کچھ کیا اور ان کی مدد نہیں کی اس کی وجہ سے ہم حق بات کہنے سے باز نہیں رہ سکتے ہیں، وہ لوگ ان ہی اوصاف کے مستحق ہیں جن کا ہم نے کتاب میں تذکرہ کیا ہے،

فقال ابان بن عثمان: ایها	ابان بن عثمان نے کہا کہ اے امیر! انھوں
الامیر لا یمنعنا ما صنعوا	نے شہید مظلوم (حضرت عثمانؓ) کے ساتھ جو
بالشهید المظلوم من	بے وفائی کی وہ ہم کو حق بات کہنے سے نہیں
خذلانه، ان نقول بالحق،	روک سکتی ہے، وہ حضرات ان ہی اوصاف
هم علی ما وصفنا لك فی	کے مستحق ہیں جن کو ہم نے اپنی اس کتاب میں
کتابنا هذا	آپ کے لیے لکھا ہے،

یہ جواب سن کر سلیمان بن عبد الملک نے کہا کہ مجھے اس کتاب کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، میں پہلے اس کے بارے میں امیر المومنین سے بات کر لوں، شاید وہ اس کی مخالفت کریں، یہ کہکر کتاب کو پھاڑ دینے کا حکم دیا اور کہا کہ یہاں سے جا کر امیر المومنین سے بات کروں گا، اگر انھوں نے رضامندی ظاہر کی تو اس کا لکھنا آسان ہے،

اس کے بعد سلیمان نے دمشق پہنچکر اپنے والد عبد الملک سے کتاب کے بارے میں ابان بن عثمان کی گفتگو نقل کی، عبد الملک نے کہا کہ ہم ایسی کتاب یہاں کیوں لائیں جس میں ہمارے لیے کوئی منقبت و فضیلت نہیں ہے، ہم اہل شام کو ایسی باتیں بتانا نہیں چاہتے ہیں، سلیمان نے باپ کی یہ باتیں سن کر کہا کہ اسی لیے میں نے جو نسخہ نقل کرایا تھا اس کو پھاڑ دینے کا حکم دیدیا تھا، آپ کی رائے مقدم ہے،[1]

---

[1] کتاب الموفقیات، ص ۲۲۲ و ص ۱۲۳، بحوالہ مغازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعروة بن الزبیر بروایۃ ابی الاسود ص ۲۰،

ابان بن عثمان نے اس موقع پر جس حق نوازی اور صدق گوئی کا مظاہرہ کیا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس دور کے علماء و مشائخ امراء و خلفاء کے دباؤ میں نہیں آتے تھے، اور دوسروں کی خوشی اور ناخوشی سے یکسو ہو کر اپنی ذمہ داری پوری کرتے تھے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابان بن عثمان اموی ہونے کے باوجود اموی حکمرانوں سے خوش نہیں تھے اور موقع بہ موقع ان پر سخت نکیر کرتے تھے، ایک مرتبہ عبدالملک بن مروان کے والی مکہ علقمہ بن صفوان بن محرث نے منبر پر حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما پر سب و شتم کیا اور منبر سے اتر کر ابان بن عثمان سے کہا کہ امیر المومنین عثمانؓ کے بارے میں مداہنت کرنے والوں کو میں نے برا بھلا کہکر آپ کو خوش کر دیا۔ یہ جملہ سن کر ابان بن عثمان نے کہا کہ واللہ یہ بات نہیں ہے بلکہ تم نے مجھے تکلیف دی ہے، میری مصیبت کے لیے یہی کیا کم ہے کہ تم بھی ان کے خون میں شریک ہو، [1]

۹۱ھ میں ولید بن عبدالملک نے والی مدینہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو حکم دیا کہ مسجد نبویؐ کی دوبارہ تعمیر کر کے اس میں اضافہ کریں اور انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تعمیر ختم کر کے نہایت خوبصورت عمارت بنوائی، تین سال میں تعمیر مکمل ہوئی تو ولید بن عبدالملک مدینہ آیا، مسجد نبوی سجائی گئی، لوگ تہنیت کے لیے آئے، ابان بن عثمان بھی پالکی پر آئے، اس وقت وہ مفلوج ہو چکے تھے، ولید کے سامنے اترے، اس نے خوش آمدید کہا اور پوچھا کہ آپ کی تعمیر کو ہماری تعمیر سے کیا نسبت ہے؟ ابان بن عثمان نے جواب دیا کہ امیر المومنین! ہماری تعمیر بہتر تھی، ولید نے پوچھا وہ کیسے؟ ابان نے کہا کہ

كانا بنيناه بنيان المساجد،	اس لیے کہ ہم نے اس کو مسجدوں کے طرز تعمیر

[1] انساب الاشراف، بلاذری ج ۵ ص ۱۲۰،

وبنيتموه بنيان الكنائس،	پر بنایا تھا اور آپ لوگوں نے اس کو
	کلیساؤں کے طرز تعمیر پر بنایا ہے،

اس کے بعد نوکروں سے کہا کہ پالکی اٹھاؤ اور چل دیئے ولید دیر تک ان کو دیکھتا رہا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ولید کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا کہ یہ عثمان بن عفانؓ کے بیٹے ہیں[1] ابان ابن عثمان ۷۶ھ سے ۸۳ھ تک مدینہ منورہ کے امیر رہے، اسی زمانہ میں امارت حج بھی ان ہی کے ذمہ رہی،

چونکہ انھوں نے اپنی کتاب المغازی میں قبائلی عصبیت اور سیاسی مصلحت سے بالاتر ہو کر واقعات و حقائق بیان کیے اموی حکمرانوں کو یہ بات ناگوار گذری اس لیے اس کی روایت عام طور سے نہیں ہوسکی، ان کے تلامذہ میں صرف مغیرہ بن عبدالرحمن مخزومی نے ان کے نام سے اس کی روایت کی اور اپنے تلامذہ اور اولاد کو اس کی تعلیم و تعلم کی ترغیب دی، ان کے صاحبزادے یحییٰ بن مغیرہ کا بیان ہے کہ میرے والد کے پاس کوئی لکھا ہوا صحیفہ اور مکتوب نہیں تھا سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مغازی کے وہ کتابی شکل میں تھی جس کو ابان بن عثمان سے حاصل کیا تھا اور یہ مغازی بسا اوقات ان سے پڑھی جاتی تھیں اور انھوں نے ہم کو ان کے پڑھنے کا حکم دیا تھا، ابن سعد نے تقریباً ان ہی الفاظ میں واقدی کا بیان یوں نقل کیا ہے۔

وكان قليل الحديث، الا مغازي	مغیرہ بن عبدالرحمن قلیل الحدیث تھے،
رسول الله صلى الله عليه وسلم	البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مغازی
اخذها من ابان بن عثمان،	ان کے پاس تھے، جن کو ابان بن عثمان سے
وكان كثيرا ما تقرء عليه،	حاصل کیا تھا اور یہ بہت زیادہ ان سے

[1] کتاب المناسک، حربی ص ۳۷۰، ریاض،

ویامرنا بتعلیمھا،[1]	پڑھے جاتے تھے اور ہم کو انکی تعلیم کا حکم دیتے تھے،

ان کے شاگردوں میں محمد بن اسحاق بھی ہیں، انھوں نے صرف غزوۂ بئر معونہ کے ذکر میں ابان بن عثمان سے ایک طویل روایت نقل کی ہے،[2]

ابان بن عثمان کے ایک اور شاگرد یعقوب بن عتبہ بن اخنس ثقفی مدنی کثیر الحدیث اور ثقہ محدث ہیں، یہ سیر و مغازی کے بھی عالم تھے، اموی امراء و عمال ان سے مدد لیتے تھے اور زکوٰۃ و صدقات کی وصولی پر متقرر کرتے تھے، ابن اسحاق نے یعقوب بن عتبہ سے دس گیارہ روایات نقل کی ہیں، ان میں سے تین روایات یوں ہیں۔

قال ابن اسحاق: وحدثنی یعقوب	مجھ سے یعقوب بن عتبہ بن اخنس نے بیان کیا
ابن عتبۃ بن الاخنس انہ حدث ان الخ[3]	کہ ان سے بیان کیا گیا ہے کہ الخ

شاید حُدِّثَ (ان سے بیان کیا گیا) والی روایات ابان بن عثمان کی ہوں، تاریخ طبری اور دوسری کتابوں میں یعقوب بن عتبہ کی بہت سی روایتیں ہیں، مگر ان میں ابان بن عثمان کا نام نہیں ہے، ظاہر ہے کہ دوسرے تلامذہ کی طرح انھوں نے بھی ابان سے کتاب المغازی کی روایت کی ہوگی،

اس کے باوجود ابان بن عثمان کی کتاب کسی نہ کسی طرح اہل علم میں متداول رہی، نویں صدی کے مشہور عالم مجد الدین فیروز آبادی صاحب قاموس متوفی ۸۲۳ھ نے "المغانم المطابۃ فی معالم طابہ" میں ان کا ایک بیان صاحب المغازی کی نسبت کے ساتھ یوں نقل کیا ہے۔

وقال ابان بن عثمان صاحب المغازی ذو قرد ماء لطلحۃ	ابان بن عثمان صاحب المغازی نے کہا ہے ذو قرد طلحہ بن عبید اللہ
ابن عبید اللہ اشتراہ فتصدق بہ علی مارۃ الطریق[4]	کا چشمہ تھا جسکو انھوں نے خرید کر راہ گیروں پر وقف کر دیا تھا،

ابان بن عثمان ایک شیعی مصنف ہے، اس نے کتاب المبدأ والمبعث والمغازی لکھی ہے، ابان بن عثمان بن عفان کی کتاب المغازی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے،

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۲۱ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۸۴ [3] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۴۵ و ص ۲۰۶ و ص ۲۶۶،
[4] المغانم المطابۃ فی معالم طابہ، قسم المواضع ص ۲۳۷، ریاض۔

اورنگ زیب کی زندگی کے اہم واقعات کی تاریخیں

ڈاکٹر عبد الرب عرفان۔ صدر شعبۂ اردو و فارسی انسٹی ٹیوٹ آرٹس اینڈ سوشل سائنسز ناگپور

(۲)

مسجد کی تعمیر

مستعد خاں جلوس عالمگیری کے دوسرے سال کے کوائف میں لکھتا ہے کہ بادشاہ درویش نش نے فریضۂ نماز با جماعت ادا فرمانے کے ارادے سے شاہی محل کے قریب سنگ مرمر کی ایک نہایت خوش قطع اور نقش و نگار سے مزین مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔ پانچ سال کے عرصے میں مسجد تعمیر و تزئین کے تمام مراحل سے گذر کر مکمل ہو گئی۔ عاقل خاں (رازی) نے آیت کریمہ:

اَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا ۝[1]

سے اس کی تاریخ تعمیر نکالی۔[2] اس آیت سے ۱۰۷۳ مستخرج ہوتا ہے جو شاہجہاں کی تخت نشینی کا سال ہے۔ چنانچہ آغا احمد علی (مصحح مآثر عالمگیری) اس پر تبصرہ فرماتے ہیں:

"عدد این آیت یک ہزار و سی و ہفت	اس آیت کا عدد ۱۰۳۷ ہے۔ عالمگیر نامہ
است۔ در عالمگیر نامہ وَاَنَّ ۔ الخ بواو	میں وَاَنَّ ۔۔ الخ واو کے ساتھ مرقوم
نوشتہ کہ اگرچہ کہ زیب و زینت و تکلفات	ہے کہ ہر چند کہ برکتوں کے انوار کے اس
این مہبط انوار برکات در سال ہزار و	مکان نزول کی زیب و زینت اور آرائش کو

---

[1] قرآن کریم سورۂ جن نمبر ۷۲/۱۸ (مسجدیں اللہ کے لیے ہیں پس ان میں نہ پکارو کسی کو اللہ کے ساتھ)

[2] مآثر عالمگیری، کلکتہ: ص ۲۹۔

ہفتاد و چہار صورت اتمام یافت لیکن اصل عمارت در سنہ ہزار و ہفتاد و سہ کہ عدد حروف این آیت وانی ہدایت مشعر برآن است، مرتب شدہ بود۔ انتہی بندہ میگوید باز دیاد شش کہ عدد واو است یکہزار و ہفتاد و سہ میشود۔ بعدد مقصود مقصود مگر آن کہ در للہ سہ لام گرفتہ شود[1]

سال ۱۰۷۴ھ میں صورت تکمیل حاصل ہوئی مگر اصل عمارت سنہ ۱۰۷۳ھ میں جیسا کہ اس آیت سراپا ہدایت کے حروف سے نکلنے والا عدد پتہ دیتا ہے، تیار ہو چکی تھی۔ آخر میں بندہ کہتا ہے کہ چھ کے اضافے سے جو واو کا عدد ہے ۱۰۷۳ھ (حاصل) ہوتا ہے۔ مطلوبہ عدد کیلئے مقصود شاید یہ ہو کہ للہ کے تین لام لیے جائیں۔

مآثر عالمگیری کے فاضل مصحح کا یہ قیاس کہ تاریخ واو کے ساتھ (جو آیت کریمہ کا جزء بھی ہے) کہی گئی ہے، درست معلوم ہوتا ہے۔ عالمگیر نامہ سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے۔ موصوف کا دوسرا قیاس بھی کہ "للہ" میں ایک زاید لام حساب میں لے لیا گیا ہوگا، خارج از امکان نہیں۔ اس کے باوصف مطلوبہ سال کے تعین میں وہ ایک بنیادی سہو کے مرتکب ہوئے ہیں۔

چونکہ مستعد خاں نے اس واقعے (یعنی مسجد کی تعمیر کے حکم) کا ذکر جلوس عالمگیری کے دوسرے سال میں کیا ہے جس کا آغاز ۲۴ رمضان ۱۰۶۹ھ سے ہوتا ہے، اس لیے موصوف نے اسی سال کو مسجد کی تعمیر کے آغاز کا سال تصور فرما لیا۔ وہ اس نکتے کو فراموش کر گئے کہ عالمگیری سالہائے جلوس کا آغاز ماہ رمضان کے آخری ایام میں عموماً ۲۴ تا ۲۶ تاریخ کو ہوتا تھا۔ گویا ہر سال جلوس ایک ہجری سال کے آخری تین ماہ اور چند دن اور اس کے بعد کے سال کے شروع کے چند روز کم نو ماہ کے عرصے پر محیط ہوتا تھا۔ چنانچہ عالمگیری سال جلوس ۱۰۶۹ھ

۱؎ مآثر عالمگیری، کلکتہ: ص ۲۹ (حاشیہ)

آغاز ۲۴ رمضان کو ہوا[1]۔ مستعد خاں نے مسجد کی تعمیر کا حکم صادر کیے جانے کا ذکر شاہزادہ محمد معظم کے عقد (۱۵ ربیع الثانی ۱۰۷۰ھ) کے بعد کیا ہے۔ لہذا مسجد کی تعمیر کے آغاز کا سال ۱۰۷۰ھ قرار پاتا ہے۔ چونکہ مسجد پانچ برس کے عرصے میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اس لیے تکمیل کا سال ۱۰۷۵ھ ہونا چاہیے۔ مگر آیت کریمہ میں واو اور ایک زاید لام کی شمولیت کے باوجود سال ۱۰۷۳ھ حاصل ہوتا ہے جو یقیناً مسجد کی تکمیل کا سال نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے درست مان لینے کی صورت میں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ مسجد کی تعمیر تین سال سے بھی کم عرصے میں عمل میں آئی۔

اس سال کے درست نہ ہونے کی توثیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت اورنگ زیب نے چھٹواں جشن جلوس ۲۶ رمضان ۱۰۷۳ھ کو راوی کے کنارے باغ دلکشا میں برپا کیا۔ وہاں سے وہ سفر کشمیر پر روانہ ہو گئے[2]۔ واپسی کے سفر میں ۱۱ ربیع الثانی ۱۰۷۴ھ کو لاہور پہنچے۔ اس وقت عاقل خاں رازی لاہور میں گوشہ نشین تھا۔ بادشاہ نے اسے گوشۂ عزلت سے نکال کر دو ہزاری سات سو سوار کے منصب پر فائز کیا[3] اور اپنے ساتھ شاہجہان آباد (دہلی) لے گئے۔ اس کے بعد ہی مسجد مکمل ہوئی ہوگی اور عاقل خاں اس آیت کریمہ کی صورت میں تاریخ تکمیل کی دریافت سے ملہم ہوا ہوگا۔

راقم السطور کا قیاس ہے کہ عاقل خاں کا دریافت کردہ مادۂ تاریخ واو کے ساتھ، جو آیت کریمہ کا جزو بھی ہے، رہا ہوگا۔ اس میں اس کا تصرف صرف یہی نہیں کہ اس نے "للہ" میں دو کے بجائے تین لام کے اعداد شمار کر لیے بلکہ "للہ" اور "اللہ" کے الف مکسورہ کے بھی (۱+۱=) ۲ عدد حساب میں لیکر مطلوبہ سال میں دو کی کمی پوری کردی ہوگی + اسطرح۔ آیت کریمہ (با واو) + لام (زاید) + دو الف مکسورہ (۱۰۴۳ + ۳۰ + ۲) کا میزان ۱۰۷۵ھ ہوتا ہے۔

۱؎ منتخب اللباب، جلد دوم: ص ۷۰، ۲؎ مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ): ص ۳۱-۳۰ ۳؎ ایضاً: ص ۳۲-۳۳

مسجد کی تکمیل کا یہی سال قرین صحت معلوم ہوتا ہے۔

وفات شاہجہاں شب دوشنبہ ۲۶ رجب ۱۰۷۶ھ کو شاہجہاں کے لیے حاکم مطلق کی جانب سے زندان عناصر سے رہائی کا پروانہ آگیا۔ اس موقع پر اشرف خاں نے تاریخ وفات کہی اور اسے اس طرح شعری پیرہن عطا کیا:

سال تاریخ فوت شاہجہاں "رضی اللہ عنہ" گفت اشرف خاں[1]
(۱۰۷۶ھ)

ایک اور نکتہ سنج نے مادۂ تاریخ — شاہجہان کرد وفات[2] — سے سال ۱۰۷۶ھ برآمد کرتے ہوئے واقعہ بھی جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا۔ یہ حضرت اورنگ زیبؒ کے دفتر حیات میں دست قضا و قدر کی ثبت کردہ غم کی دوسری بڑی مد تھی۔ ان کے جذبات غم واندوہ کا اندازہ اس خط سے کیا جاتا ہے جو انھوں نے اپنی ہمشیرۂ کلاں شاہزادی جہاں آرا بیگم کے نام اس "قضیۂ ناگزیر" کے بعد تحریر فرمایا[3]

حالات فتح ملک دکن[4]

۱۰۹۲ھ

حضرت اورنگ زیبؒ کے پچاس سالہ دور حکومت (۱۰۶۸ھ تا ۱۱۱۸ھ) کو جو بذات خود ایک تاریخ ہے، پچیس پچیس برس کے دو مساوی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور شمالی ہند میں بسر ہوا اور دوسرا دور دکن میں۔

بائیسویں سال جلوس میں حضرت اورنگ زیبؒ نے احکام شریعت کے مطابق پایۂ تخت اور تمام صوبوں کے ذمیوں سے جزیہ وصول کرنے کا حکم صادر فرمایا[5]۔ اس فرمان

۱؎ و ۲؎ مآثر عالمگیری، ص ۲۰۔ خافی خاں نے صرف مادۂ دوم شاہجہاں — الخ نقل کیا ہے (منتخب، دوم، ص ۱۸۶) ۳؎ رقعات عالمگیر، مرتبہ نجیب اشرف ندوی: ص ۲۵۳ ۴؎ دکن کی مہمات پر حضرت عالمگیرؒ کی روانگی کی تاریخ (۱۰۹۲ھ)۔ از راقم السطور ۵؎ مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ) ص ۱۲۱۔

کے خلاف راجپوتوں نے شورش برپا کر دی۔ لہٰذا ان کی گوشمالی کے لیے حضرت اورنگ زیبؒ نے شاہزادہ محمد اکبر کو روانہ کیا[1]۔ راجپوتوں نے اسے اپنے فریب کے جال میں کچھ اس طرح پھانسا کہ وہ باپ سے سرکشی کر بیٹھا۔ اب اس کی تنبیہ و تادیب بھی ضروری ہو گئی تھی۔ ان اسباب و علل کے تحت حضرت اورنگ زیبؒ نے بنفس نفیس دکن کا رخ کیا اور اوائل رمضان ۱۰۹۲ھ میں اجمیر سے برہان پور کی جانب کوچ کیا۔ وہاں سے وہ اورنگ آباد پہنچے اور اورنگ آباد پہنچ کر شاہزادہ محمد معظم کو رام درہ کی تسخیر اور شاہزادہ محمد اعظم کو قلعۂ سالیر کی تفتیح پر مامور فرمایا[2]۔

تسخیر سالیر قلعۂ سالیر جو قلعۂ ملہیر سے متصل تھا، چند برسوں سے "غنیم لئیم" کے قبضے میں تھا۔ قلعہ کسی جدال و قتال کے بغیر ملہیر کے قلعہ دار نیک نام خاں کی حکمت عملی سے فتح ہو گیا[3]۔ جب اس فتح کی خبر بارگاہ عالمگیری میں پہنچی تو نعمت خاں عالی نے، بقول خود، تاریخ فی البدیہہ کہی:

از سعی شاہ اعظم غازی خدیو دہر	ملک دکن تمام بشمشیر فتح شد
آمد نوید فتح ز سالیر نزد شاہ	عالی بدیہہ گفت کہ سالیر فتح شد[4]

(۱۰۹۲ھ)

فتح حیدرآباد شاہزادہ محمد معظم کو جسے رام درہ کی تسخیر کے لیے بھیجا گیا تھا، حالات کی

۱؎ منتخب اللباب، جلد دوم: ص ۲۶۲ ۲؎ ایضاً، ص ۲۸۰ ۳؎ ایضاً ص ۲۸۱ ۴؎ دیوان نعمت خاں عالی (مطبع نولکشور): ص ۲۳۱ — دیوان میں سالیر کے بجائے سالہیر چھپ گیا ہے۔ مادۂ تاریخ کے نیچے سال بھی ۱۰۹۰ھ ثبت ہے۔ ہر چند کہ سالہیر (بہ ہائے مخلوط) سے مصرع کا وزن ساقط نہیں ہوتا لیکن یہ درست نہیں۔ اول تو قلعے کا نام "سالیر" ہے (منتخب اللباب جلد دوم: ص ۲۸۰) دوسرے ۱۰۹۰ھ میں محمد اعظم گولکنڈہ کی مہم میں شریک رہا ہے۔

ناسازگاری کے باعث واپس بلا لیا گیا۔ اسی زمانے میں والیِ تلنگانہ ابوالحسن تانا شاہ کے بارے میں بعض ایسی خبریں موصول ہوئیں جن کے پیشِ نظر بادشاہ نے حیدرآباد پر لشکرکشی ضروری سمجھی۔ اس مہم کے اسباب خافی خاں نے قدرے تفصیل سے بیان کیے ہیں، جن کا ملخص یہ ہے:

(۱) ابوالحسن نے سارا ملکی انتظام مادنا اور آکنا نامی دو "شدید العداوت" برہمنوں کے سپرد کر دیا تھا جو اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں پر بہت زیادہ ظلم اور سختی کر رہے تھے۔

(۲) ملک (تلنگانہ) میں فسق و فجور، شراب نوشی اور لہو و لعب کا عام اور علانیہ رواج ہو گیا تھا۔ خود تانا شاہ شراب و کباب کی مستیوں اور حسن و شراب کی رنگینیوں میں کھو گیا تھا۔

(۳) ابوالحسن نے مرہٹا سردار سنبھاجی کو مغل لشکروں پر تاخت و تاز کے لیے ایک لاکھ ہن (طلائی سکہ جو تلنگانہ میں رائج تھا) کی مالی اعانت دی تھی اور اپنے اس عمل سے خود کو "بدنام و زبان زدِ عالم" بنا لیا تھا۔

(۴) ابوالحسن نے سید مظفر حیدرآبادی کی مدد سے حکومت حاصل کی تھی اور اسے وزارت کا قلمدان بخش دیا تھا لیکن مادنا اور آکنا کے زیرِ اثر آتے ہی انکے ورغلانے پر اسے معزول کر کے قید خانے بھجوا دیا تھا۔ سید مظفر کے بیٹے میر ہاشم نے بادشاہ سے التدعا کی کہ وہ حیدرآباد تسخیر کر کے اس کے والد کو تانا شاہ کی قید سے رہائی دلائیں۔ اس کی درخواست مسموع ہوئی۔[1]

[1] منتخب اللباب جلد دوم: ص ۳-۲۹۲

انہی آوان میں خبر آئی کہ ابوالحسن گولکنڈہ سرکار کے مال کھیڑ، سیرم اور چند دیگر علاقوں پر اس دعوے کے ساتھ متصرف ہو گیا تھا کہ یہ پرگنے اور علاقے سابق میں تلنگانہ کے حصے تھے۔ اب حیدرآباد پر لشکرکشی میں تاخیر کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی، حضرت اورنگ زیبؒ نے فوراً شاہزادہ محمد معظم کو حیدرآباد کے استیصال پر مامور کر کے رخصت فرمایا۔[1] ابوالحسن نے بھی شاہی لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے چالیس ہزار سوار روانہ کیے۔ دونوں فوجیں بیجاپور اور حیدرآباد کی سرحد پر ایک دوسرے کے مقابل فروکش ہوئیں۔ محمد اعظم نے کشت و خون سے گریز کرتے ہوئے چند شرطوں کے ساتھ صلح کی سلسلہ جنبانی کی، لیکن حریف نے انھیں ماننے سے انکار کر دیا۔ نتیجۃً ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں حیدرآبادی پسپا ہوئے۔ شاہی لشکر میں فتح کے شادیانے بجائے گئے اور عرضداشت فتح حضور میں روانہ کی گئی۔ شاہزادے کا عریضہ ۳۰ ذی القعدہ (۱۰۹۶ھ) کو پہنچا۔ اس موقعے پر مستعد خاں کی روایت کے مطابق میرزا محمد حاجی[2] المعروف بہ نعمت خاں پسر حکیم فتح الدین عم حکیم محسن خاں نے تاریخ فتح نظم کر کے ملاحظہ عالی میں پیش کی:

از نصرت پادشاہ غازی	گردید دلِ جہانیان شاد
آمد بقلم حساب تاریخ	شد فتح بجنگ حیدرآباد[3]

[1] منتخب اللباب، جلد دوم: ص ۲۹۳ [2] خوشگو کی روایت کے مطابق عالی حج کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوا (سفینۂ خوشگو، دفتر ثالث، ص ۵۹) لیکن خان آرزو کی ایک لطیفہ نما روایت سے اس کی تردید ہوتی ہے (مجمع النفائس، مخطوطہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد نمبر ۳۰۰۸، ورق ۳۲۸ ب - ۳۲۹ الف)۔ خود عالی نے بھی اپنے "محروم زدہ کعبہ" رہنے کی بات بڑے حسرت بھرے لہجے میں کہی ہے (دیوان: ص ۲۱۷) دراصل اسے اس کے شیوۂ "ہاجی" کی بنا پر "ہاجو" بہارے ہنوز (یعنی ہجو گو) کہا جاتا تھا۔ حاجی اسی لفظ کی تحریف ہے [3] مآثر عالمگیری، مستعد خاں

مصرعِ آخر سے سال ۱۰۹۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ مصرعہائے ماقبل میں تعمیے کا کوئی قرینہ بھی موجود نہیں جس کے مطابق مادۂ تاریخ سے متخرج ہونے والے عدد میں ایک کی تخفیف کر کے مطلوبہ سال دریافت کیا جا سکے۔ علاوہ بریں، صورتِ حال یہ بھی نہیں کہ ۱۰۹۶ھ کے اواخر میں حاصل ہونے والی اس فتح کی خبر ۱۰۹۷ھ کے اوائل میں حضرت اورنگ زیب تک پہنچی ہو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستعد خاں سے اس قطعے کے بے مورد نقل کرنے کا سہو ہوا ہے۔ بعض قرائن اس قیاس کی توثیق کرتے ہیں۔

جہاں تک مآثرِ عالمگیری کا تعلق ہے، اس کو عہدِ عالمگیر کی مستند تاریخ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ بقول مولانا شبلی نعمانی:

"عالمگیر کو اس کا مسودہ دکھلا کر منظور کرا لیا جاتا تھا۔ اس بنا پر یہ الفاظ گویا عالمگیر کی زبان کے ہیں۔"[1]

لیکن خود مآثرِ عالمگیری میں بعض ایسے شواہد موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ کچھ عرصے بعد بند ہو گیا ہوگا۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ مستعد خاں ۱۰۹۶ھ کے کوائف میں منقولہ بالا قطعۂ تاریخ نقل ہوئے تاریخ گو یعنی میرزا محمد کو "المعروف بہ نعمت خاں" لکھتا ہے۔ "نعمت خاں" میرزا محمد (متخلص بہ عالی) کا پہلا خطاب ہے جو اسے بارگاہِ عالمگیری سے ۱۱۰۳ھ میں مرحمت ہوا تھا[2]۔ اس تناظر میں بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ مستعد خاں نے محولۂ بالا ۱۰۹۶ھ کے حالات ۱۱۰۳ھ میں یا اس کے بعد تحریر کیے ہیں۔

یہ قطعۂ تاریخ نعمت خاں عالی کے اس دیوان میں شامل نہیں جو اس نے، بقولِ خود،

[1] سفر جنوبی عالمگیر، کانپور ۱۹۱۱: ص ۳۱۔ [2] خطاب یابی کی تاریخ نعمت خاں عالی نے "شکرِ نعمت" [illegible] سے نکالی ہے (دیوان، مخطوطہ سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد نمبر ۲۱۷: ورق ۱۳ ب

"حسب الحکم بادشاہ"[1] (حضرت اورنگ زیب) ۱۱۰۵ھ میں مرتب کیا تھا[2]۔ اسے بھی نرائن شفیق نے گلِ رعنا[3] میں اور محمد ولی بن عثمان بیدری نے مدحت الشعرا[4] میں نقل کیا ہے۔ لہٰذا فتح کے سال اور قطعے کے مصرعِ تاریخ سے برآمد ہونے والے عدد میں عدمِ مطابقت نیز دیوانِ عالی میں اس کے شامل نہ ہونے کے ممکنہ اسباب دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے:

(۱) یہ قطعۂ تاریخ تعمیے کے بغیر کہا گیا ہے۔ اس سے سال ۱۰۹۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ اگر الفِ ممدودہ کا دو عدد شمار کریں تو ۱۰۹۸ھ متخرج ہوتا ہے۔

(۲) ۱۰۹۸ھ قلعۂ گولکنڈہ کی تسخیر کا سال ہے۔ ممکن ہے عالی نے قطعہ اسی موقعے کے لیے کہا ہو لیکن اس بار حیدرآباد کشت و خون کے بغیر تصرف میں آیا تھا۔ اردوئے معلّٰی کی پیش قدمی کی خبر سنتے ہی ابوالحسن قلعۂ گولکنڈہ میں پناہ گزیں ہو گیا تھا۔

(۳) چونکہ سال کا عدد "بجنگ" سے پورا ہوتا ہے جبکہ واقعے کا بیان "بے جنگ" کا متقاضی ہے، شاید اسی وجہ سے عالی نے اسے دیوان میں شامل نہیں کیا ہوگا۔

(۴) الفِ ممدودہ کا دو عدد شمار کرنا بھی اصولِ تاریخ گوئی سے انحراف ہے۔ اغلب ہے کہ سبب نمبر ۳ کے ساتھ یہ عیب بھی عالی کے پیشِ نظر رہا ہو۔ ورنہ جس قطعے کی بدولت وہ "مرحمتِ خلعت" سے سرفراز ہوا[5]، اسے اپنے دیوان میں شامل نہ کرنے کے اور کیا اسباب ہو سکتے ہیں۔

[1] دیوان نعمت خاں عالی (مخطوطہ سالار جنگ میوزیم نمبر ۲۱۷): ورق ۱۲ الف [2] تاریخ تدوین ــــ اوراقِ گلِ شیرازہ کردــــ سے برآمد ہوتی ہے (دیوان، مخطوطہ، ورق ۱۲ ب [3] مخطوطہ، سالار جنگ میوزیم، نمبر ۳۰۱: ورق ۳۴۸ ب [4] مخطوطہ، سالار جنگ میوزیم، نمبر ۳۰۸: ورق ۲۰۳ ب [5] سروِ آزاد، آزاد بلگرامی، ۱۹۱۳: ص ۱۳۶ نیز مآثرِ عالمگیری۔

فتح بیجاپور

بیجاپور کی ریاست دکن کی ان پانچ ریاستوں میں سے ایک تھی جو باہم برسر پیکار رہا کرتی تھیں۔ اکبر نے تیموری مملکت میں ان کے الحاق کی کوشش کی تھی، مگر جہانگیر اور شاہجہاں ان سے دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتے تھے۔ دکن کے ابن الوقت حکمرانوں سے وفا کی توقع ان کی خام خیالی تھی۔ ان کی فطرت ان لچک دار پودوں کی سی تھی جو ہوا کا تیز جھونکا آنے پر جھک جاتے ہیں مگر اس کے گذرتے ہی پھر تن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ شاہجہاں ان کے استیصال پر مجبور ہو گیا۔ اس نے ۱۰۶۷ھ میں حضرت اورنگ زیب کو بیجاپور کی تسخیر پر مامور کیا تھا۔ ابھی وہ فتح سے ہمکنار ہونے ہی والے تھے کہ شاہجہاں پر بیماری کا شدید حملہ ہوا (۷ ذی الحجہ ۱۰۶۷ھ) اور دارا شکوہ نے مملکت کے جملہ امور اپنے ہاتھ میں لے لیے[۱]۔ اس کے ساتھ ہی ان تمام نامور امیروں اور سرداروں کے نام واپسی کا حکم صادر کروا دیا جو حضرت اورنگ زیب کے ساتھ مہم میں شریک تھے۔ مجبوراً انھیں سکندر عادل شاہ سے مصالحت کرنی پڑی تھی[۲]۔

بیجاپور اور تلنگانہ کی ریاستوں کے مرہٹوں خصوصاً شیواجی اور ان کے بیٹے سنبھاجی سے گہرے روابط تھے۔ مرہٹوں کو مغل علاقوں پر چھاپا مارنے، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کرنے کے لیے بیجاپور اور تلنگانہ کی ریاستوں سے فوجی اور مالی اعانت بھی ملتی تھی چنانچہ خافی خاں لکھتا ہے:

"چوں از فساد و نفاق بیجاپوری یعنی سکندر والی آنجا کہ وارث ملک ہم نبود ہمدم باغنیم رفاقت می نمود، متواتر بعرض رسید، مکرر

چونکہ بیجاپوری یعنی وہاں کے حاکم سکندر کی مفسدہ پردازی اور دشمنی کے بارے میں جو ملک کا وارث بھی نہیں تھا اور اس کے باوجود دشمن کے

فرمان نصیحت آمیز از راہ تہدید و وعدہ و وعید صادر گردید، فایدہ نبخشید[۱]۔"

ساتھ رفاقت کر رہا تھا، متواتر اطلاعات پہنچیں اور تہدید و وعدہ و وعید کے نصیحت آمیز فرمان مکرر صادر کیے گئے، کوئی فایدہ نہیں ہوا۔

ان حالات نے حضرت اورنگ زیب کو دونوں ریاستوں کے استیصال پر مجبور کر دیا۔ شاہزادہ محمد اعظم کو بیجاپور کی تسخیر کے لیے رخصت کیا گیا۔ امرائے عالمگیر کے باہمی نفاق کے باعث محاصرہ طول پکڑتا گیا۔ حالات پر قابو پانے کے لیے خود حضرت اورنگ زیب کو محاذ پر جانا پڑا۔ ۲۵ شوال (۱۰۹۷ھ) کو وہ اس دمدمے کا معائنہ کرنے کی غرض سے جا رہے تھے جسے قلعے کے کنگرے کے برابر پہنچا دیا گیا تھا۔ میر عبدالکریم تخت رواں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے اسی وقت تاریخ کا مصرع:

فتح بیجاپور زودی می شود

موزوں کیا اور سیسے کے قلم سے کاغذ پر لکھ کر پیش کیا۔ اسے پڑھ کر بادشاہ نے آمین کہا۔ قلعہ اسی ہفتے میں (۴ ذی القعدہ کو) فتح ہو گیا[۲]۔

منقولۂ بالا مصرع سے ۱۰۹۹ھ متخرج ہوتا ہے جبکہ فتح بیجاپور کا سال ۱۰۹۷ھ ہے۔ غالباً مصرع تاریخ کی پیش کش کے لیے کم از کم ایک مصرع اور کہا گیا ہوگا جس میں دو عدد کے تخرجے کا کوئی قرینہ موجود ہوگا۔ اپنی موجودہ صورت میں یہ مصرع تاریخ بڑا گمراہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔

خافی خاں نے بھی اس واقعے کی ایک تاریخ:

سد سکندر گرفت

نقل کی ہے[1] اس سے سال ۱۰۹۸ھ برآمد ہوتا ہے۔ چونکہ یہ مادۂ تاریخ بحرِ منسرح مثمن مطوی مکشوف میں کہا ہوا آدھا مصرع ہے، اس لیے گمان غالب یہ ہے کہ یہ مادہ بھی تعمیے کے ساتھ منظوم رہا ہوگا:

اس موقعے کے لیے قابل خاں (ابنِ میر کاظم منشی) نے آیت کریمہ

اَخْرَجْنَاهُمْ مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ وَّکُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ کَرِیْمٍ[2]

کی صورت میں ایک بے مثال تاریخ دریافت کی۔[3] اس کی خوبی یہ ہے تاریخ گو نے کسی تصرف کے بغیر اس آیت میں تعمیے کا ایک پُر لطف اور بامعنی قرینہ ڈھونڈ نکالا جس سے نہ صرف فتح بیجاپور کا سال برآمد ہوتا ہے بلکہ حالات کی صورت اور واقعے کی نوعیت بھی واضح اور روشن ہو جاتی ہے۔ آیت کا ترجمہ ذیلی حاشیے (نمبر ۲) میں پیش کیا جا چکا ہے۔ لیکن تاریخ گو کا مدعا یہ ہے کہ "ہم نے هُمْ کو (جس کا عدد ۴۵ ہے) جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ وَّکُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ کَرِیْمٍ سے (جس کا مجموعی عدد ۱۱۴۲ ہے) خارج کر دیا۔" اس طرح (۱۱۴۲ − ۴۵ = ۱۰۹۷) مطلوبہ سال نکل آیا۔

اس تاریخ کا ایک دلچسپ نکتہ یہ بھی ہے کہ ضمیر جمع غایب هُمْ (یعنی وہ سب مرد) جس کے عدد کو جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ــــ الخ کے عدد سے خارج کیا گیا نظام تعمیہ میں ڈھلنے کے بعد بھی بے معنی نہیں رہی اور سب سے زیادہ پُر لطف بات یہ ہے کہ صورت تعمیہ خود آیت کریمہ کے الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ تاریخ گو نے صرف اس کی

[1] منتخب اللباب، جلد دوم: ص ۳۲۲ [2] نکال لائے ہم انھیں انکے باغوں اور چشموں اور خزانوں اور ان کی بہترین قیام گاہوں سے (قرآن کریم، الشعرا ۲۶/ $\frac{۵۷}{۵۸}$) [3] کلمات الشعرا، محمد افضل سرخوش (تصحیح صادق علی دلاوری) لاہور: ص ۱۲۰

نشاندہی کی ہے۔ اس لحاظ سے یہ مادۂ تاریخ اپنی مثال آپ ہے اور اپنے دریافت کنندہ کی جودتِ طبع پر دال ہے۔

قلعۂ بیجاپور میں ایک عظیم الشان دیو پیکر توپ نصب تھی۔ اس کا نام "ملک میدان" تھا۔ قلعے کی تسخیر کے ساتھ وہ توپ بھی تصرف میں آئی۔ نعمت خاں عالی نے جو وقایع نگار کی حیثیت سے رکابِ شاہ میں موجود تھا اور تاریخ گوئی کے فن پر خاصی قدرت رکھتا تھا، ایک قطعۂ تاریخ کہا جس میں بڑے لطیف اور بامعنی تعمیے کے ساتھ فتح بیجاپور کے علاوہ "ملک میدان" کے ہاتھ آنے کا بھی ذکر کیا ہے۔ کہتا ہے:

شاہ عالمگیر غازی بادشاہِ دین پناہ
آنکہ داد عدل داد و ملکِ شاہان را گرفت
فتح بیجاپور کرد و بہرِ تاریخ ظفر
رو نمود اقبال و گفتا ملک میدان را گرفت[1]

۱۰۹۶ + ۱ = ۱۰۹۷ھ

تسخیر گولکنڈہ

بیجاپور کی تسخیر کے بعد حضرت اورنگ زیبؒ کی توجہ حیدرآباد اور گولکنڈہ کے استیصال پر مرتکز ہوئی۔ حیدرآباد اور گولکنڈہ پر لشکر کشی کے اسباب جو خافی خاں کے حوالے سے بیان کیے جا چکے ہیں، اُن کے علاوہ جس بات نے حضرت اورنگ زیبؒ کو گولکنڈہ کی تسخیر اور اس کے مملکت تیموریہ میں الحاق کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ ابوالحسن کے ایک خط سے عبارت ہے جو اس نے اپنے ایک سردار کے نام اس وقت لکھا تھا جب حضرت اورنگ زیبؒ بیجاپور کے محاصرے میں مصروف تھے۔ اس خط کے مشمولات کا خلاصہ یہ تھا کہ حضرت اورنگ زیبؒ نے بیجاپور کے والی سکندر عادل شاہ کو یتیم اور کمزور جان کر بیجاپور کا محاصرہ کر لیا ہے۔ اب ایک طرف سے سنبھا جی تمھارے فوج کے ساتھ آ رہا ہے اور دوسری طرف سے میں چالیس ہزار کا لشکر بھیجتا ہوں۔

[1] دیوان نعمت خاں عالی (مطبع نولکشور): ص ۲۲۹

دیکھیں کہ حضرت عالمگیر کس کس کا مقابلہ کرتے ہیں[1]۔ اس خطا نے حضرت اورنگ زیب کے نائرۂ اشتعال کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔ شاہی لشکر کو گولکنڈہ کی طرف کوچ کرنے کا حکم صادر ہوا۔

۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۸ھ کو قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا[2]۔ حرب و ضرب، زد و خورد اور پیش قدمی و پسپائی سے بھرپور آٹھ مہینے کے محاصرے کے دوران بارش و سیلاب، قحط و گرانی اور وبائی امراض نے بھی مغلوں کا زبردست امتحان لیا جس کے باعث لشکر میں بددلی اور مایوسی کے آثار بھی ظاہر ہوئے مگر اس لاتقنطوا من رحمۃ اللہ پر پختہ ایمان رکھنے والے کے پائے استقامت کو ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ انجام کار اواخر ذی القعدہ میں روح اللہ خاں کی تدبیر سے قلعہ فتح ہو گیا[3]۔ غالباً نعمت خاں عالی نے وہ قطعۂ تاریخ جس کے مصرعے:

شد فتح بجنگ حیدرآباد

سے الف ممدودہ کا دو عدد شمار کرنے کی صورت میں ۱۰۹۸ھ نکلتا ہے اسی موقعے پر کہا ہوگا۔

درج ذیل قطعۂ تاریخ میں عالی نے بیجاپور کی فتح کا ضمناً ذکر کرتے ہوئے تسخیر گولکنڈہ کی تاریخ اس طرح کہی ہے:

شاہ عالمگیر غازی بادشاہ دین پناہ	مالک الملک جہان از قوت شمشیر شد
چون بتائید الٰہی بود ہر عزمی کہ کرد	ہر زمان تقدیر یا وریاور تدبیر شد
کرد رو با دولت و اقبال بر فتحِ دکن	ملک بیجاپور و گلکنڈہ ہمہ تسخیر شد
خواستم تاریخ این کشورستانیہا ز دل	گفت دل: کلِّ جہان از شاہ عالمگیر شد[4]
	۱۰۹۸ھ

[1] مآثر الامرا، جلد سوم، شاہنواز خاں خوافی (کلکتہ ۱۸۹۱): ص ۶۲۲ تا ۶۲۹ [2] منتخب اللباب، جلد دوم، ص ۳۲۹ نیز مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ): ص ۲۰۳ [3] منتخب اللباب، جلد دوم: ص ۳۶۱ [4] دیوان نعمت خاں عالی: ص ۲۲۹ — (دیوان میں اس قطعے کا سرنامہ "تاریخ فتح بیجاپور

اس عظیم الشان فتح پر نعمت خاں عالی نے ایک اور بے مثال قطعۂ تاریخ کہا ہے[1]
جسے تاریخ گوئی میں اس کا شاہکار قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا قطعہ درج ذیل ہے:

زہق الباطل است جاء الحق	معنیِ فتح شاہ عالم گیر
سالِ تاریخ از خرد جستم	قطعہ ای گفت عقلِ خوش تقریر
بوالحسن داشت جا بچار محل	بدرش کرد ازین مکان تقدیر
چون برون رفت او بجاش نشست	شاہ اورنگ زیب عالم گیر[2]

"چار محل" قلعے کے اندر ابوالحسن کی تعمیر کروائی ہوئی ایک نہایت خوشنما عمارت تھی۔ ابوالحسن اسی میں رہتا تھا۔ گولکنڈہ پر تسلط کے ساتھ ہی یہ عمارت بھی حضرت اورنگ زیب کے قبضے میں آگئی۔

اس قطعے کا دلچسپ اور دلآویز پہلو یہ ہے کہ اس میں بیان واقعہ ہی وہ عمل ہے جس سے جمع و تفریق کے قاعدے سے مطلوبہ سال برآمد ہوتا ہے۔ اس معما نما مادۂ تاریخ کا حل ملاحظہ فرمائیں:

بوالحسن چار محل میں قیام پذیر تھا۔ یعنی بوالحسن کا عدد (۱۵۷) چار محل کے عدد (۲۸۲) میں موجود تھا[3]۔ تقدیر نے بوالحسن کو چار محل سے نکال کر باہر کیا۔ یعنی چار محل کے عدد سے بوالحسن کے عدد کو منہا کر دیا گیا (۲۸۲ - ۱۵۷ = ۱۲۵)۔ جب ابوالحسن چار محل سے نکل گیا تو اس کی جگہ "شاہ اورنگ زیب عالمگیر" متمکن ہو گئے۔ یعنی حاصل تفریق

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۸) "حسب الحکم بادشاہ عالمگیر گفتہ شد" چھپا ہے جو درست نہیں۔ یہ بنیادی طور پر گولکنڈہ کی تاریخ فتح ہے۔ اس میں بیجاپور کا نام ضمناً آیا ہے۔ [1] دیوان نعمت خاں عالی: ص ۲۲۹ [2] ہر چھوٹا عدد اپنے سے بڑے عدد میں موجود ہوتا ہے، مثلاً ۱۰ میں '۱' سے '۹' تک کے اعداد موجود ہیں۔

"۱۲۵ میں شاہ اورنگ زیب عالمگیر" کے عدد (۹۷۳) کو جمع کر دیا گیا (۱۲۵+۹۷۳=۱۰۹۸)
اور اس طرح مطلوبہ سال نکل آیا۔

اس قطعے کی شان نزول احمد علی سندیلوی یوں بیان فرماتے ہیں:

"ابوالحسن عرف تاناشاہ والی حیدرآباد در قلعۂ انجام مکانی بس مطبوع ساختہ موسوم بچار محل در آنجا مسکن خود قرار دادہ بود۔ ہرگاہ اورنگ زیب آنرا مفتوح ساختہ نعمت خاں عالی بطریق تعمیہ تاریخ گزارشید پسند خاطر والا افتاد"[1]

حیدرآباد کے والی ابوالحسن عرف تاناشاہ نے وہاں قلعے میں ایک انتہائی خوشنما عمارت چار محل کے نام سے تعمیر کروا کے اسے اپنا مسکن بنایا تھا۔ جس وقت اورنگ زیبؒ نے اسے فتح کیا نعمت خاں عالی نے تاریخ بطریق تعمیہ (کہہ کر) پیش کی جو خاطر والا کو پسند آئی۔

پروفیسر محی الدین قادری زورؔ کے بقول عالی نے یہ قطعہ اس وقت کہا جب حضرت اورنگ زیبؒ نے چار محل میں دربار منعقد کیا[2]۔ ان دونوں بیانات سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ منقولہ بالا قطعۂ تاریخ عالی نے از خود اور محض بادشاہ کی خوشنودی کے لیے کہا یا ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا نے اس سے کہلوایا لیکن خود نعمت خاں عالی لکھتا ہے کہ جب بادشاہ نے چار محل میں قدم رکھا تو ان کی نظر اس کتبے پر پڑی جس پر عمارت کی تاریخ اتمام کندہ تھی۔ انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ تاریخ تسخیر کا بھی ایک کتبہ نصب کیا جائے۔ چنانچہ عالی نے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے قطعۂ مذکور فی البدیہہ کہہ کر پیش کر دیا[3]۔ اگر عالی کا

[1] مخزن الغرایب (مخطوطہ خدابخش لائبریری، پٹنہ نمبر ۲۴۰) ذکر نعمت خاں عالی [2] فرخندہ بنیاد حیدرآباد (حیدرآباد ۱۹۵۲ء)، ص ۴۸ [3] بہادر شاہ نامہ (مخطوطہ برٹش میوزیم لندن نمبر 26.OR) ۔ مائکروفلم: ورق ۲۱۳ ب

بیان درست ہے (اور اس پر شبہ کرنے کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں) تو اس قطعے کو تاریخ گوئی میں اس کا معجزہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس موقعے پر شیخ عبدالصمد جعفر خاں (منشی) کے بیٹے عبدالوالی نے بھی طبع آزمائی کی اور درج ذیل رباعی تہنیت کے بطور خدمت میں پیش کی:

ای شاہ جہان جہان پناہی کردی — فتح عجب از لطف الٰہی کردی
از مصرع تاریخ شنو مژدۂ نو — فتح الہابی (زن) پادشاہی کردی[1]
۱۰۹۸ھ

اسی طرح ایک نثری تاریخ کہہ کر میر عبدالکریم نے بھی حضرت عالمگیرؒ کو اس فتح پر ان الفاظ میں مبارکباد پیش کی:

"فتح قلعۂ گولکنڈہ مبارک باد"
۱۰۹۸ھ

مستعد خاں لکھتا ہے کہ جہاں پناہ نے یہ تاریخ بے حد پسند فرمائی[2]۔

قلعۂ ادونی کا الحاق

یکم ربیع الآخر (۱۰۹۹ھ) کو حضرت اورنگ زیبؒ حیدرآباد سے بیجاپور کی جانب روانہ ہوئے۔ اب ان کا مقصد ان تمام علاقوں کو فتح کرنا تھا جو ہنوز ممالک محروسہ میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ علاوہ بریں سنبھاجی کو اس کی شرانگیزیوں اور فتنہ پردازیوں کی قرار واقعی سزا بھی دینی تھی، اس مقصد کے لیے محمد اعظم شاہ کو چالیس ہزار تجربہ کار سواروں کے ساتھ سنبھاجی کی سرکوبی پر مامور فرمایا[3]۔

عادل شاہیوں کے زوال کے بعد سکندر عادل شاہ کے باپ کے ایک غلام مسعود حبشی نے اسے بساط سیاست کا شاہ بنا کر اس کے تمام مال و متاع پر قبضہ کر لیا تھا اور ادونی کے قلعے میں پناہ گزیں ہو گیا تھا۔ لہٰذا حضرت اورنگ زیبؒ نے نواب فیروز جنگ بہادر کو پچیس (۲۵) ہزار سواروں پر

[1] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ) ص ۲۱۱ [2] ایضاً [3] ایضاً: ص ۲۱۶۔

مشتمل لشکر کے ساتھ مسعود حبشی کی تادیب کے لیے رخصت فرمایا۔

فیروز جنگ نے قلعے کا محاصرہ کر کے پہلے مسعود کو نصیحت سے راہ راست پر لانے کی کوشش کی لیکن بے سود، مجبوراً اسے جارحانہ کارروائی کرنی پڑی۔ تھوڑی سی تاخت و تاراج نے مسعود کو مغلوں کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۸ رشوال (۱۰۹۹ھ) کو وہ قلعے سے باہر نکل آیا اور اس پر تیموری پرچم لہرا دیا گیا۔ اس کامیابی کی تاریخ کسی صاحب طبع نے کہی ہے کہ:

فتح آدونی نمودہ بادشاہ دین پناہ[1]
(۱۰۹۹)

یہ مادۂ تاریخ اپنی فصاحت، سلاست، صفائی اور سادگی کے باوجود متعلقہ واقعے کی نوعیت سے بڑی دور کی نسبت رکھتا ہے۔ اگر واقعات کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قلعۂ ادونی خود بادشاہ دین پناہ نے (بزور شمشیر) فتح کیا۔

سنبھا کی اسیری سنبھا اپنے باپ شیواجی کی موت (۱۰۹۱ھ) کے وقت پرنالہ[2] میں تھا۔ شیواجی کے مرنے کے بعد اس نے اپنے سوتیلے بھائی راجہ رام کو قید کر لیا۔ وہ بے حد ظالم اور پرلے درجے کا عیاش اور بدکار تھا۔ اس کے ہاتھوں مسلمان تو درکنار، خود ہندو اور اس کے ہم قوم تک سخت اذیت کے شکار تھے۔ خافی خاں اسے "دہ برابر موذی تر از سیوا"[3] قرار دیتا ہے۔ اس کی سفاکی، بے رحمی، عیاشی اور عورتوں سے بدسلوکی کی داستانیں معاصر تاریخوں میں تفصیل سے پڑھی جا سکتی ہیں[4] جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، اس کے استیصال پر شاہزادہ محمد اعظم کو مقرب خاں کے ساتھ مامور

[1] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ): ص ۲۲۱ [2] ستارا سے سات کوس پر واقع دشوار گذار گھاٹیوں سے گھرا ہوا قلعہ جو دکن کا دوسرا ناقابل تسخیر قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ اسے حضرت اورنگ زیبؒ نے ۱۱۱۳ھ میں فتح کیا۔
[3] منتخب اللباب جلد دوم: ص ۳۸۳ [4] ملاحظہ فرمائیں منتخب اللباب جلد دوم ص: ۳۹۰-۳۹۱۔

کیا گیا تھا۔ اس نے مہم کا آغاز توابعات بیجاپور کے قلعے بلگاؤں کی تسخیر سے کیا۔

سنبھا نے نو سال ظلم و ستم اور عیش و عشرت میں بسر کیے۔ جب مقرب خاں اپنے جاسوسوں کی نشاندہی پر قلعہ سنگمیز (بروایت جدو ناتھ سرکار سنگمیشور[1]) پر صرف تین سو سواروں کے ساتھ جا پہنچا تو سنبھا کو ہوش آیا۔ اس نے تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ مدافعانہ جنگ لڑی لیکن گرفتار ہوا۔ اس کے بیوی بچے بھی حراست میں لے لیے گئے۔ سنبھا کو پابجولاں بادشاہ کے حضور میں لے جایا گیا۔ اکثر شاعروں اور انشاپردازوں نے اس موقعے پر تاریخیں کہیں[2] لیکن محمد اعظم کے وکیل عنایت اللہ کی کہی ہوئی تاریخ، جس سے نہ صرف واقعے کا مکمل سال برآمد ہوتا ہے بلکہ واقعے کا واقع علم بھی ہوتا ہے، بادشاہ کو سب سے زیادہ پسند آئی۔ تاریخ کا مصرع یہ ہے:

بازن و فرزند سنبھا شد اسیر[3]
(۱۱۰۰)

یہ مادۂ تاریخ اپنے اجمال کے دامن میں واقعات کی پوری تفصیل سموئے ہوئے ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ غرابت اور حشو و زوائد کے عیوب سے یکسر پاک ہے۔ اس موقعے کے لیے شاید اس سے بہتر مادۂ تاریخ کسی نے نہ کہا ہوگا۔ اسی لیے سخن شناس بادشاہ نے عنایت اللہ کو شاہانہ عنایتوں سے سرفراز فرمایا[4]

(باقی)

[1] تاریخ اورنگ زیبؒ، جلد چہارم (انگریزی): ص ۳۹۹ [2]، [3] و [4] مآثر عالمگیری (اردو ترجمہ): ص ۲۲۶ — (سنبھا اپنی شر انگیزی کے باعث پہلے ہی سے گردن زدنی تھا۔ اسکی دریدہ دہنی اور بدزبانی کو دیکھتے ہوئے حضرت عالمگیرؒ نے قتل سے پہلے اس کی زبان کھنچوا لی تھی۔)

نسخۂ حمیدیہ سے نسخۂ شیرانی تک

از
(پروفیسر جگن ناتھ آزاد شعبۂ اردو جموں، یونیورسٹی)

جب تک انتخاب کلام غالب کا وہ مخطوطہ منظرِ عام پر نہیں آیا تھا جو نسخۂ عرشی زادہ کے نام سے مشہور ہے، اس وقت تک محققین کا خیال یہ تھا کہ دیوان غالب کا سب سے پرانا مخطوطہ نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) ہے جو نواب غوث محمد خان صاحب کے بیٹے نواب میاں فوجدار محمد خان کا مملوکہ سمجھا جاتا ہے اور جس کی کتابت ۱۸۲۱ء میں ہوئی۔[۱]

۱؎ یہ مجموعہ مفتی انوار الحق نے مرتب کر کے ۱۹۲۱ء میں چھپوایا تھا۔ اسکی تمہید میں وہ لکھتے ہیں۔

"اس کے علاوہ اس کتاب میں ڈاکٹر عبد الرحمان صاحب بجنوری مرحوم کا بسوط مقدمہ شائع ہو رہا ہے، جس میں غالب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے" لیکن راقم التحریر کی تحویل میں نسخۂ حمیدیہ کا جو مطبوعہ ایڈیشن ہے اور جس پر تاریخِ اشاعت ۱۹۲۱ء درج ہے اس میں عبد الرحمان بجنوری کا دیباچہ شامل نہیں ہے۔

دراصل یہ دیباچہ بعض جلدوں میں ہے اور بعض میں نہیں ہے، بعد میں یہی دیباچہ محاسن کلام غالب کے نام سے بجنوری مرحوم کی الگ تصنیف کے طور پر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کی طرف سے شائع ہوا۔

ویسے بھی مفتی انوار الحق کا مرتب کیا ہوا اور شائع کیا ہوا نسخۂ حمیدیہ اس مخطوطے پر کام کرنے والوں کی صحیح معنی میں رہنمائی نہیں کرتا بقول مالک رام یہ نہایت غلط طریقے پر مرتب ہوا، متن اور حواشی دونوں آخر کا کلام گڈمڈ کر دیا گیا، متن کے کلام کی ترتیب بدل دی گئی، صحتِ کتابت کا معیار بھی بہت ناقص رہا، پھر مرتب نے مزید ظلم یہ کیا کہ متداول دیوان کو اس کے ساتھ ملا دیا۔

اس اعتبار سے محققینِ غالب کے نزدیک نسخۂ شیرانی کلام غالب کا دوسرا اور اہم مستند نسخہ تھا جو حافظ محمود شیرانی کی ملکیت تھا اور اب پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانے میں محفوظ ہے "اہلِ علم کا خیال ہے کہ نسخۂ شیرانی ۱۸۲۷ - ۱۸۲۶ کے قریب یعنی نسخۂ حمیدیہ کے پانچ چھ سال بعد مرتب ہوا تھا"[۱]

لیکن جب نسخۂ عرشی زادہ[۲] منظرِ عام پر آیا (جس کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ مخطوطہ بقلمِ غالب ہے) اور اس میں اہلِ علم حضرات کے سامنے یہ عبارت آئی:

"بتاریخ چہاردہم رجب المرجب یوم سہ شنبہ سنہ ہجری وقت دو پہر روز باقیماندہ فقیر بیدل اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ متخلص بہ اسد عفی اللہ عنہ از تحریر دیوان حسرت عنوان خود فراغت یافتہ بہ لکھ کاوش مضامین دگر بہ رجوع بہ خیال روح میرزا علیہ الرحمہ آوردہ فقط"

تو اس میں سنہ کی عدم موجودگی موضوعِ بحث بن گئی، سید قدرت اللہ نقوی نے اس موضوع پر "اردو نامہ" کراچی کے شمارہ نمبر ۳ میں مفصل بحث کی اور اس نتیجے پر پہونچے کہ اس مخطوط کا سنہ کتابت ۱۲۳۱ھ ہے یعنی ۱۸۱۶ء عیسوی اور اس اعتبار سے اسے نسخۂ حمیدیہ پر فوقیت حاصل ہے

۱؎ پیش لفظ نسخۂ شیرانی (مطبوعہ مجلس ترقی ادب ۲۔ کلب روڈ لاہور) اشاعت اول ۱۹۶۹ء یہ پیش لفظ ناشر کا لکھا ہوا ہے اور ناشر اس کتاب کے سید امتیاز علی (ستارۂ امتیاز) ہیں جو اس وقت مجلس ترقی ادب لاہور کے ناظم تھے، گویا یہ پیش لفظ سید امتیاز علی تاج ہی کا لکھا ہوا ہے۔

۲؎ ماہنامہ شاعر بمبئی۔ غالب نمبر (ادارہ:- اعجاز صدیقی۔ ہندر ناتھ) فروری و مارچ ۱۹۶۹ء۔ مضمون بعنوان "کچھ نسخۂ حمیدیہ کے بارے میں" ص ۹۶۔

کہ یہ اس سے پانچ یا چھ برس پہلے معرض وجود میں آیا۔

اس لحاظ سے جب ہم ان نسخوں کی ترتیب کا تعین کرتے ہیں تو نسخۂ شیرانی کو کلام غالب کا تیسرا اور اہم مستند نسخہ قرار دیتے ہیں، یہ مخطوطہ حافظ محمود شیرانی مرحوم کے اس ذخیرہ کتب میں شامل ہے، جو اس وقت پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے پاس ہے، لیکن اس بات کا ابھی تک پتہ نہ چل سکا کہ حافظ محمود شیرانی کو یہ نسخہ کہاں سے حاصل ہوا

مجلس ترقی ادب لاہور کے مذکورہ بالا مطبوعہ نسخے کے پیش لفظ میں بھی اس بات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ دراصل یہ پیش لفظ محض ایک شاعرانہ انداز کی تحریر ہے، اور اس کے مطالعے سے تحقیق کا کوئی پہلو قاری کے سامنے نہیں آتا۔ ظاہر ہے کہ سید امتیاز علی تاج سے اس امر کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

اس سلسلے میں ابو محمد سحر لکھتے ہیں:۔ "دوسرا قلمی دیوان جو نسخۂ بھوپال کی اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل ہے تقریباً ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) میں مرتب ہوا، چونکہ یہ حافظ محمود شیرانی کے پاس رہ چکا ہے، اس لیے نسخۂ شیرانی کہلاتا ہے۔" یہ بات ابو محمد سحر صاحب نے بغیر کسی دلیل کے کہی ہے، یہ تو خیر ظاہر ہی ہے کہ وہ مخطوطہ جس کا نام نسخۂ شیرانی ہے، پروفیسر محمود خاں شیرانی کو کہیں سے ملا ہوگا لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ نسخۂ بھوپال (یعنی مذکورہ نسخۂ حمیدیہ) اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل میں پروفیسر محمود شیرانی کے پاس کچھ مدت کے لیے رہا۔ "یہ کچھ مدت" کی طرف میں اشارہ اس لیے کر رہا ہوں کہ "رہ چکا ہے" کے معنی یہی ہیں کہ کچھ مدت ان کے پاس رہا اور پھر کہیں اور چلا گیا۔

دوسری بات اس سلسلے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ "اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل" کے معنی یہ ہیں کہ اس میں بعض غزلوں پر غالب نے نظرثانی کی، بعض کو خارج کر دیا اور بعض میں سے

انتخاب کیا۔ یہی بات ڈاکٹر گیان چند نے زیادہ واضح الفاظ میں لکھی ہے، اور اپنی تحریر میں گنجلک پن یا ابہام نہیں رہنے دیا۔ ڈاکٹر گیان چند تفسیر غالب کے دیباچے میں غالب کے غیر متداول کلام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ "غیر متداول حصہ ذیل کے کلام پر مشتمل ہے۔

(۱) "نسخۂ حمیدیہ" کی اصل نسخۂ بھوپال کا بڑا حصہ۔ اس نسخے کا انتخاب نسخۂ شیرانی ہے اور اس کا انتخاب "گل رعنا"۔[1]

گویا وہ صرف یہ نہیں کہتے "نسخۂ شیرانی" "نسخۂ حمیدیہ" کا انتخاب ہے یعنی وہ نسخۂ حمیدیہ کی اصل یعنی نسخۂ بھوپال کے بڑے حصے کیطرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مخطوطے کی نشاندہی کبھی نہ ہوئی جسے ابو محمد صاحب سحر "نسخۂ حمیدیہ" کی اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل" کہہ رہے ہیں۔

اب آگے چلنے سے پہلے اس سلسلے میں ایک نظر مولانا امتیاز علی عرشی کی تحریر پر بھی ڈال لینا چاہیے، وہ "دیوان اردو نسخۂ بھوپال" کے زیر عنوان لکھتے ہیں:۔ میرزا صاحب نے اپنا ردیف وار اردو دیوان صفر ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) میں صاف کرایا تھا۔ اس کی اصل کوئی مردف دیوان تھا یا وہ بیاض تھی جس میں بہ ترتیب نظم اشعار لکھے گئے تھے۔ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ابھی تک کوئی مسالا نہیں مل سکا لیکن یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مرزا صاحب نے ۱۲۳۷ھ سے قبل کے کہے ہوئے متعدد شعر اس میں شامل نہیں کیے تھے۔ ۔ ۔ ۔

"لیکن اس دیوان کے اشعار کا بڑا حصہ پیچیدہ، خیالی مضامین اور مغلق تشبیہ و استعارہ پر مشتمل تھا۔ ۔ ۔ ۔ چنانچہ بہت سی غزلیں "غلط" قرار دیں۔ فقرے، مصرعے اور شعر بھی بدلے اور آسان اور دلنشیں انداز کی غزلیں بھی کہیں۔

---

[1] تفسیر غالب (ڈاکٹر گیان چند) ناشر جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز (۱۹۷۱ء) صفحہ ۹۔

"تہذیب اور تنقیح کا یہ کام صفر ۱۲۳۷ء (اکتوبر ۱۸۲۱ء) کے بعد شروع ہوا اور سفر کلکتہ سے پہلے شوال ۱۲۴۲ھ (اپریل ۱۸۲۶ء) میں ختم ہوگیا۔ اس قیاس کی وجہ یہ ہے کہ نسخۂ بھوپال کے حاشیوں اور بین السطور میں ترمیمیں اور اصلاحیں بھی ہیں اور نئے شعراء کی غزلیں بھی۔ نیز ردیف الیاء کی متعدد غزلیں آخر میں بھی تحریر کر دی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اصلاح و اضافہ کا یہ کام اس کی تاریخ کتابت کے بعد ہی شروع کیا جا سکتا تھا ورنہ وہ سب کچھ بجائے حاشیوں کے متن ہی میں درج ہوتا۔

"نیز مولانا محمود خاں شیرانی مرحوم کے پاس دیوان کا وہ مخطوطہ دستیاب ہو چکا ہے جو بھوپالی نسخے کا مبیضہ تھا۔ اس کے متن کے مندرجات بالکل بھوپالی نسخے کی ترمیموں کے مطابق ہیں لیکن حاشیوں پر بعد کی لکھی ہوئی غزلیں بھی درج ہیں۔ ان میں سے دو میرزا صاحب نے باندہ (بندھیل کھنڈ) سے بھیجی تھیں جو سفر کلکتہ کی ایک منزل تھی۔ ظاہر ہے کہ نسخۂ شیرانی سفر کلکتہ سے پہلے ہی مرتب نہ ہو گیا ہوتا تو اس کے حاشیوں پر سفر کے دوران لکھی گئی غزلیں کس طرح مندرج ہو سکتی تھیں"[1]

ان تین محققینِ غالب کی تحریروں کی روشنی میں جو نکات سامنے آئے ہیں وہ یہ ہیں:۔

۱۔ "نسخۂ شیرانی" نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) کی اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل ہے (ابو محمد سحر)

۲۔ نسخۂ حمیدیہ کی اصل نسخۂ بھوپال کا انتخاب نسخۂ شیرانی ہے (ڈاکٹر گیان چند)

۳۔ نسخۂ بھوپال (یعنی حمیدیہ) میں غالب نے بہت سی غزلیں "غلط" قرار دیں...... مصرعے اور شعر بھی بدلے ..... نسخۂ شیرانی بھوپال نسخے کا مبیضہ ہے۔ اس کے متن کے مندرجات بالکل بھوپال نسخے کی زمینوں کے مطابق ہیں۔ (مولانا امتیاز علی خاں عرشی)

ان تینوں ماہر غالبیات کے بیانات سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کا مخطوطہ غالب کی

---

[1] دیوان غالب اردو ـ نسخۂ عرشی (مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی) پہلی اشاعت ۱۹۵۸ء ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڈھ۔ صفحہ ۱۹-۲۰

نظر سے گذرا تھا اور انھوں نے اس پر نظر ثانی کی تھی بلکہ محمد انوار الحق ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم بھوپال جن کی مساعی سے نسخۂ حمیدیہ ۱۹۲۱ء میں چھپ کے سامنے آیا یہاں تک لکھتے ہیں

"یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ ترمیم و تصحیح کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا ہے اور ان کی نظر سے گذرا ہے اور انھوں نے خود اس میں جابجا اصلاحیں کی ہیں"[1]

مولانا امتیاز علی خاں عرشی مفتی انوار الحق کی اس تحریر کا حوالہ دیتے ہوئے کہ یہ نسخہ لکھا تو گیا تھا فوجدار محمد خاں بہادر بھوپال کے لیے لیکن کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا اور انکی نظر سے گذرا' لکھتے ہیں

"لیکن فی الحقیقت یہ مرزا صاحب ہی کے لیے لکھا گیا تھا اور نسخۂ شیرانی کی تیاری تک انہی کے پاس رہا تھا' اسکے بعد عبد العلی صاحب اور عبد الصمد منظر کے پاس ہوتا ہوا فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں پہنچا۔ بھوپال پہنچنے کا زمانہ کیا تھا اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ۱۲۴۳ھ والی مہر بتاتی ہے کہ بہر حال اس سال کے بعد ہی اسے وہاں باریابی حاصل ہوئی ہوگی"[2]

گویا عرشی صاحب جہاں مفتی انوار الحق کی اس رائے کو تقویت پہنچاتے ہیں کہ "کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا اور ان کی نظر سے گذرا" وہاں یہ کہہ کر انوار الحق صاحب کی تحقیق کی تنقید بھی کر رہے ہیں کہ "فی الحقیقت یہ مرزا صاحب ہی کے لیے لکھا گیا تھا اور

---

[1] دیوان غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ بہ تدوین احقر العباد ضیاء العلوم مفتی محمد انوار الحق ایم۔ اے منشی فاضل ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم بھوپال (۱۹۲۱ء)۔ طابع مفید عام اسٹیم پریس آگرہ صفحہ ۷۔

[2] دیوانِ غالب اردو (نسخۂ عرشی) پہلا ایڈیشن صفحہ ۷۰

نسخۂ شیرانی کی تیاری تک انہی کے پاس رہا تھا۔" یعنی بقول عرشی صاحب یہ مخطوط غالب کی نظر سے محض گذرا ہی نہیں بلکہ یہ لکھا بھی گیا میرزا صاحب ہی کے لیے اور نسخۂ شیرانی کی تیاری تک انہی کے پاس رہا (دوسرے لفظوں میں یہ مخطوطہ کوئی چھ سال تک غالب ہی کی تحویل میں رہا)

اب اس بات کے متعلق کہ یہ مخطوطہ غالب کی نظر سے گذرا یا نہیں میں ذرا بعد میں اپنی ناقص رائے کا اظہار کروں گا لیکن عرشی صاحب کا یہ کہنا کہ یہ مخطوطہ مرزا صاحب ہی کے لیے لکھا گیا تھا قرین قیاس نہیں۔ کیونکہ عرشی صاحب نے بھوپال میں اپنے دوروزہ قیام میں اس نسخے کو دیکھنے کے بعد جو کچھ اس کے متعلق لکھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ اپنے لیے نہیں لکھوایا بلکہ کسی بڑے آدمی کو پیش کرنے کے لیے لکھوایا ہے۔ بقول عرشی صاحب مخطوطے کا "کاغذ عمدہ کشمیری ہے، جدولیں رنگین اور طلائی اور باریکا لاجوردی ہے۔ عنوانات شنجرفی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ دیوان کا آغاز رنگین اور طلائی لوح کے تحت ہوا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ورق ۱۵ الف، دوسری رنگین اور طلائی لوح کے تحت غزلیں شروع ہوئی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ آخر میں کاتب نسخہ نے شنجرفی روشنائی سے لکھا ہے :۔ "دیوانِ من تصنیف میرزا صاحب و قبلہ المتخلص بہ اسد و غالب، سلمہم ربہم، علی ید العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر ۱۲۳۷ھ من الہجرۃ النبویہ صورتِ اتمام یافت[1]"

یہ اہتمام غالب نے اس مخطوطے کے لیے کیا ہو جو انھوں نے اپنے لیے لکھوایا ہو بعید از قیاس ہے۔

بقول جناب مالک رام نسخہ حمیدیہ غالب کی نظر سے نہیں گذرا[2] اور یہی خیال دقیع معلوم

[1] دیوانِ غالب اردو (نسخۂ عرشی) پہلا ایڈیشن صفحہ ۶، [2] مالک رام صاحب نے زبانی مجھ سے یہی فرمایا تھا، یہ کوئی ڈیڑھ ماہ کی بات ہے لیکن انھوں نے گفتارِ غالب میں یہ لکھا ہے کہ ترقیمے کا انداز یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ خود غالب نے لکھوایا تھا۔ یہ نسخہ مدتوں ان کے پاس رہا۔ غالباً اب مالک رام صاحب کا خیال یہ ہے کہ نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) غالب کی نظر سے نہیں گذرا تھا۔ (آزاد)

ہوتا ہے۔ بالخصوص محمد انوار الحق کے اس مکمل بیان کی روشنی میں جس کے ابتدائی جملے پہلے درج کیے جا چکے ہیں۔ اپنے اس دعوے کے بعد کہ غالب نے خود اس میں جابجا اصلاحیں کی ہیں۔ محمد انوار الحق اپنی عبارت کو یوں مکمل کرتے ہیں

"کیونکہ اگرچہ ان اصلاحوں کا خط بہت خراب اور شکستہ لیکن پھر بھی اس میں اور غالب کی طرز تحریر کے موجودہ[1] نمونوں میں ایک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے اور گو محض اسی کی بنا پر ان کو غالب کا قلمی نسخہ قرار دینا شاید درست نہ ہو لیکن خود ان اصلاحوں کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کو مصنف کے سوا اور کسی کے قلم کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے کیونکہ ان میں سے اکثر ایسی ہیں کہ لفظ کو کاٹ کر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا ہے یا کسی مصرعے کی کچھ صورت بدل دی ہے۔ بہت سی غزلیں بھی اسی قلم سے حاشیہ پر بڑھائی گئی ہیں جن میں سے بیشتر مروجہ دیوان میں بجنسہٖ موجود ہیں۔ البتہ بعض ایسی بھی ہیں کہ ان میں بھی دوبارہ کچھ انتخاب ہوا ہے اور مطبوعہ دیوان میں ان کے پورے شعر شایع نہیں ہوئے لیکن حقیقت میں اس امر کا ثبوت کہ یہ کتاب غالب کا گم شدہ دیوان ہی ہے خط کی مشابہت اور کاتب کی تحریر کا محتاج نہیں ہے بلکہ اس کی سب سے بڑی اور یقینی دلیل خود اس کے اشعار ہیں ع

آفتاب آمد دلیل آفتاب"

ظاہر ہے کہ یہ تحریر تحقیق کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔ انوار الحق صاحب نے پہلے ایک فیصلہ کر لیا ہے اور پھر اس فیصلے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے وہ محض اندازوں سے کام لیتے چلے گئے ہیں۔ اب مشکل یہ ہے کہ اصل مخطوطہ تو گم ہو چکا ہے اور مطبوعہ کتاب میں اس قسم کی تحریر قاری کے

[1] غالباً یہ لفظ "موجود" ہوگا۔

اس خیال کو پختہ تر کرتی ہے کہ یہ نسخہ غالب کی نظر سے نہیں گذرا۔ اس صورت میں نسخۂ حمیدیہ کو نسخۂ شیرانی کے مانند مستند اور معتبر قرار دینا دونوں نسخوں کے گہرے اور بااحتیاط مطالعے پر مبنی نہیں ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے بقول مولانا عرشی "مولانا محمود خاں شیرانی کے پاس دیوان کا وہ مخطوطہ دستیاب ہوچکا ہے جو بھوپالی نسخے کا مبیضہ تھا" نیز یہ کہ "اس کے متن کے مندرجات بالکل بھوپالی نسخے کی ترمیموں کے مطابق ہیں" لیکن مطبوعہ نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی کا تقابلی مطالعہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے اس بیان کی تائید نہیں کرتا اور نہ ہی ڈاکٹر گیان چند کے اس بیان کی تائید اس تقابلی مطالعے سے ہوتی ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کا انتخاب نسخۂ شیرانی ہے۔ کیونکہ اگر نسخۂ شیرانی نسخۂ حمیدیہ کا مبیضہ ہے یا نسخۂ شیرانی نسخۂ حمیدیہ کا انتخاب ہے تو نسخۂ شیرانی میں وہ چھ[۶] غزلیں کیسے شامل ہوگئیں جو نسخۂ حمیدیہ میں سرے سے موجود نہیں ہیں اور وہ چھ[۶] غزلیں یہ ہیں۔

۱۔ بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہوگئے اتنے ہی کم ہوئے

۲۔ عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پانو سے ہے دو قدم آگے

۳۔ جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یا رب اسے قسمت میں عدو کی

۴۔ فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے

۵۔ رونے سے اور عشق میں بے باک ہوگئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے

۶۔ خود فروشی ہائے ہستی بس کہ جائے خندہ ہے
ہر شکستِ قیمتِ دل میں صدائے خندہ ہے

ان غزلوں کی نشاندہی ڈاکٹر وحید قریشی نے کی ہے[1] لیکن ڈاکٹر وحید قریشی بھی چونکہ اس خیال سے متفق ہیں کہ نسخۂ بھوپال (یعنی موجودہ مطبوعہ نسخۂ حمیدیہ کا اصل مخطوطہ) غالب کی تحویل میں رہا اس لیے وہ ان غزلوں کی نسخۂ شیرانی میں موجودگی اور نسخۂ بھوپال میں عدم موجودگی سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ

"جس وقت یہ غزلیں لکھی گئیں (جو نسخۂ شیرانی کے متن میں درج ہیں اور نسخۂ بھوپال کے متن اور حواشی اور آخر کے اضافات دونوں سے خالی ہیں) اس وقت تک نسخۂ بھوپال غالب کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس لیے یہ غزلیں اس میں جگہ نہ پاسکیں[2]"

لیکن ڈاکٹر وحید قریشی اس بات کا کوئی ثبوت بہم نہیں پہنچاتے کہ نسخۂ بھوپال غالب کی تحویل میں رہا۔ ہاں اتنا ضرور لکھتے ہیں کہ "نسخۂ بھوپال کب تک غالب کی دسترس میں رہا اسے نسخۂ شیرانی کی روشنی میں دیکھنے کی ضرورت ہے"[3]

اور جب ہم نسخۂ شیرانی کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو یہی نظر آتا ہے کہ نسخۂ بھوپال غالب کی تحویل میں کبھی نہیں رہا اور عرشی صاحب کے اس دعوے کی بھی تائید نہیں ہوتی کہ نسخۂ شیرانی کے متن کے مندرجات بالکل بھوپالی نسخے کی ترمیموں کے مطابق ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر غزلوں میں

---

[1] نذرِ غالب (ڈاکٹر وحید قریشی) سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور۔ مطبع منصور پریس لاہور (۱۹۷۰) صفحہ ۱۲۳ [2] نذرِ غالب (ڈاکٹر وحید قریشی) سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور۔ مطبع منصور پریس لاہور (۱۹۷۰) صفحہ ۱۲۴ [3] نذرِ غالب (ڈاکٹر وحید قریشی) سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور۔ مطبع منصور پریس لاہور (۱۹۷۰) صفحہ ۱۲۴۔

اشعار کی ترتیب بھی مختلف ہے۔ غزلوں کی ترتیب بھی اکثر و بیشتر مختلف ہے۔ اس طرح کی مثالیں ایک نہیں بہت ہیں۔ پہلی غزل میں تو ایک عجیب بات یہ بھی نظر آتی ہے کہ غزل کا مقطع

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

جو نسخۂ بھوپال میں موجود ہے اور نسخۂ شیرانی سے غائب ہے، ہاں حافظ محمود شیرانی نے حاشیے میں اپنے قلم سے اس کا اضافہ کیا ہے اور مطبوعہ نسخہ بھوپال کے "آتش زیر پا" کو جو غلط ہے صحیح کر دیا ہے، اور اسے "آتش زیر پا" لکھا ہے۔

ایک اور غزل دیکھئے۔ جنوں گرم انتظار و نالہ بیتابی کمند آیا۔ اس میں شعر کے مصرع اول میں غالب نے دوبار ترمیم کی ہے۔ پہلے اس مصرعے کی صورت یہ تھی

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، نادیدنی دعوت

بعد میں انھوں نے اس میں ترمیم کر کے اسے یہ صورت دی

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، خون جگر ہدیہ

دوسری بار جب غالب نے اس مصرعے میں ترمیم کی تو "خون جگر" کی جگہ "داغ جگر" لکھا اور مصرع یوں ہو گیا

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغ جگر ہدیہ

مطبوعہ نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) میں اس کی پہلی دونوں صورتیں ہیں لیکن نسخۂ شیرانی میں اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ بھی پہلی۔ یعنی

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، نادیدنی دعوت

اور شیرانی صاحب نے حاشیے پر اپنے ہاتھ سے نادیدنی دعوت کے سامنے "داغ جگر ہدیہ" لکھ دیا ہے جو اس ترمیم کی دوسری اور مصرعے کی تیسری صورت ہے اور جو متداول دیوان میں ہے۔

نسخۂ حمیدیہ کے ترقیمے کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے کہ اس ترقیمے سے مالک رام صاحب یہ اندازہ کرتے ہیں کہ "یہ نسخہ خود غالب نے لکھوایا تھا اور یہ مدتوں ان کے پاس رہا"۔ اس ضمن میں مالک رام صاحب یہ بھی لکھتے ہیں: "میرا اپنا خیال یہ ہے کہ جب اس نسخے کا مبیضہ (یعنی مسودۂ نسخۂ شیرانی) تیار ہو گیا تو یہ گویا تقویم پارینہ کے ذیل میں چلا گیا۔ اسی زمانے میں غالب کے شاگرد میاں یار محمد خاں شوکت بھوپالی نے اسے ان سے حاصل کر لیا اور لے جا کر اسے اپنے والد میاں فوجدار محمد خاں بہادر کی خدمت میں پیش کر دیا"۔[1]

لیکن ترقیمے کی عبارت سے تو اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ فوجدار محمد خاں کے لیے نہیں لکھوایا گیا بلکہ قرین قیاس بات جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نسخے کا کاتب حافظ معین الدین بہت پڑھا لکھا اور خوش ذوق آدمی ہے اور غالب سے بے پناہ عقیدت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ان کے نام کی جگہ بھی مرزا صاحب اور قبلہ کے الفاظ لکھتا ہے۔ اور گمان یہ ہے کہ اس نے غالب سے عقیدت کی بنا پر اپنے لیے یہ نسخہ تیار کیا اور اسے ہر طرح سے سجایا۔ ترقیمے میں کسی ممدوح کا نام تو کیا اس کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں ملتا۔

اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ عرشی صاحب کے الفاظ میں "معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان عبدالعلی نام کے کسی صاحب ذوق کے مطالعے میں بھی رہ چکا ہے۔ انھوں نے کئی جگہ اپنی پسندیدگی اشعار کا اظہار حاشیوں پر صاد بنا کر کیا ہے اور اکثر جگہ اس صاد کے ساتھ اپنا نام بھی لکھ دیا ہے۔ ردیف "غ" کی پہلی غزل

عشاق اشک چشم سے دھوئیں ہزار داغ

کے متعدد شعروں کے مقابل "پسند عبدالعلی" لکھا ہے

[1] گفتار غالب (مالک رام)، ناشر مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ ۱۹۸۵ء۔ صفحہ ۱۵۷۔

اسی ردیف کی دوسری غزل کے مقابل لکھا ہے "پسند خاطر عبد العلی"۔ ورق ۲۰ ب کے اوپر کے حاشیے میں لکھا ہے "مقابلہ کردہ شد"

"ردیف ۱۲۹ الف کے حاشیے میں باریک کے اندر لکھا ہے "محمد عبد الصمد منظر"[1] اس صورت حال کے پیش نظر قیاس یہی کہتا ہے کہ یہ فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں عبد العلی اور محمد عبد الصمد منظر نامی دو اشخاص کے ہاتھوں سے گذر کر پہنچا ہے۔

غالباً یہ مخطوطہ جس کی کتابت حافظ معین الدین ایسے پڑھے لکھے اور خوش مذاق کاتب نے کی تھی عبد العلی اور محمد عبد الصمد منظر تک پہنچنے کے بعد فوجدار محمد خاں کے کتبخانے کے لیے خرید لیا گیا۔ اگرچہ فوجدار محمد خاں کی مہر کے ساتھ اس قسم کا کوئی اندراج نہیں ہے لیکن اصل مخطوطہ چونکہ گم ہو چکا ہے اس لیے اس طرح کے قطعی ثبوت کی تلاش لاحاصل ہے۔

اب اس سلسلے میں نسخۂ عرشی کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔ محترم عرشی صاحب لکھتے ہیں:۔ بد خطی میں جو اضافے یا اصلاحیں ہیں ان میں املے کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً ..... تقاضا کو تقضہ لکھا ہے ..... بہانہ کو بہانیے لکھا ہے .....

مضائقہ نہ کرے میں مضاعقہ ..... رنگ ہے سنگِ محک دعوائی بینائی عبث ہے سنگِ محک یا خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں ہیں بھاگے نگے .....
اس قسم کی غلطیاں غالب جیسے شخص سے ۲۵ سال کی عمر میں سخت حیرت انگیز ہیں"[2] تو اس سلسلے میں کہنا یہ ہے کہ غالب سے املا کی ان غلطیوں کی توقع نہیں لیکن جب غالب کی تحویل میں یہ نسخہ رہا ہی نہیں تو وہ ان اغلاط کی اصلاح کیسے کرتے۔ گویا

---

[1] نسخۂ عرشی پہلا ایڈیشن صفحہ ۷۸ [2] ایضاً ص ۸۰

عرشی صاحب کی یہ تحریر اسی جانب اشارہ کرتی ہے کہ غالب نے نسخۂ بھوپال (یعنی حمیدیہ) نہیں دیکھا۔

جب ابو محمد سحر کہتے ہیں کہ نسخۂ شیرانی نسخۂ بھوپال (یعنی نسخۂ حمیدیہ) کی اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل ہے تو کیا وہ یہ فرض تو نہیں کر رہے ہیں کہ مذکورہ نسخۂ حمیدیہ کے علاوہ بھی اس کا کوئی مبیضہ ہوگا اور عرشی صاحب بھی جب نسخۂ حمیدیہ کے مبیضہ کی بات کرتے ہیں تو کیا وہ بھی اسی امر کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ مذکورہ نسخۂ بھوپال نہیں بلکہ اس کا ایک مبیضہ اور بھی ہو سکتا ہے اور وہ مبیضہ شیرانی صاحب کے پاس رہا۔ ہاں یہ مفروضہ کہ نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی کے درمیان ایک اور نسخے کی موجودگی کا امکان ہے یہ گتھی کھول سکتا ہے۔ اگرچہ یہ مفروضہ بھی اس سوال کے جواب کی طرف رہنمائی نہیں کرتا کہ یہ مبیضہ حافظ محمود شیرانی تک کس طرح پہنچا۔

ساتھ ہی ان کا خیال یہ بھی ہے کہ عرشی صاحب جب یہ لکھتے ہیں کہ

"فی الحقیقت یہ مرزا صاحب ہی کے لیے لکھا گیا تھا اور نسخۂ شیرانی کی تیاری تک ان ہی کے پاس رہا تھا اور اس کے بعد عبد العلی صاحب اور عبد الصمد منظر کے پاس سے ہوتا ہوا فوجدار محمد خاں کے کتاب خانے میں پہنچا"[1]

تو وہ گویا اس مخطوطے کی موجودگی کو ایک طرح سے خارج کر دیتے ہیں۔ لیکن جب ہم نسخۂ شیرانی میں ایسے اشعار موجود پاتے ہیں جو نسخۂ بھوپال میں نہیں ہیں تو عرشی صاحب کا یہ کہنا قرین قیاس نہیں رہتا کہ نسخۂ شیرانی کے متن کے مندرجات بالکل بھوپالی نسخے کی زمینوں کے مطابق ہیں مثلاً یہ غزل دیکھیے۔

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا

---

[1] نسخۂ حمیدیہ (مولانا امتیاز علی خاں عرشی) پہلا ایڈیشن صفحہ ۷۸

نسخۂ بھوپال میں یہ غزل مندرجۂ ذیل اشعار پر مشتمل ہے۔

اف نہ کی گو سوزِ دل سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

دود میرا سنبلستاں سے کرے ہے ہمسری
بسکہ شوقِ آتشِ گل سے سراپا جل گیا

شمع رویاں کی سرانگشتِ حنائی دیکھ کر
غنچۂ گل پر فشاں پروانہ آسا جل گیا

خانمانِ عاشقاں دوکانِ آتش باز ہے
شعلہ رویاں جب ہوئے گرمِ تماشا جل گیا

تا کجا افسوسِ گرمیہائے صحبت اے خیال
دل بہ آتش خیزیِ داغِ تمنا جل گیا

ہے اسد بیگانۂ افسردگی اے بے کسی
دل زِ اندازِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

لیکن نسخۂ شیرانی میں ان کے علاوہ وہ پانچ اشعار[1] بھی ہیں جو بعد میں مطبوعہ متداول

---

[1] دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

دیوان میں شامل ہیں اور وہ پانچ اشعار الگ نہیں ہیں بلکہ غزل ہی میں مختلف ترتیب سے شامل ہیں۔

اپنی اس بحث کو ختم کرنے کے بعد جوان دو نتیجوں پر پہنچی ہے کہ "نسخۂ شیرانی نہ تو نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) کا انتخاب ہے اور نہ ہی یہ نسخۂ بھوپال کا بیضہ ہے۔ (جہاں تک نسخۂ بھوپال کا تعلق ہے مذکورہ نسخۂ حمیدیہ کے علاوہ بھی اس کا کوئی نسخہ ہوگا (نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی کے درمیان) جس نے نسخۂ شیرانی کی بنیاد کا کام دیا ہوگا۔ قدرت اللہ نقوی کی مذکورہ کتاب "نسخۂ شیرانی" کی یہ عبارت[1] پیش کرنا مناسب خیال کرتا ہوں۔

"۱۔ نسخۂ شیرانی نسخۂ حمیدیہ کی نقل نہیں ہے۔

۲۔ نسخۂ حمیدیہ کے حواشی اور آخر میں غزلیات کا مختلف القلم اندراج اس بات کا ثبوت ہے کہ غالب کے کسی اور دیوان سے وقتاً فوقتاً نقل کا عمل ہوتا رہا اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ کلام شیرانی کے مسودے سے نقل ہوا اور نسخۂ شیرانی کی تبییض سے کافی مدت قبل یہ عمل ختم ہو چکا تھا۔"

"گل رعنا" "عاشق نامۂ غالب" میں بھی قدرت اللہ نقوی نے اس موضوع کو چھیڑا ہے اس میں "نسخۂ حمیدیہ" کے زیرِ عنوان وہ لکھتے ہیں: "جا بجا اصلاحات و ترامیم مختلف حضرات کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بتائی گئی ہیں۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ اولاً متن کسی مخطوطے سے نقل کیا گیا اور بعد میں اضافے اور اصلاحیں دوسرے کسی ایسے مخطوطے سے نقل ہوئیں جس میں غالب نے یہ تمام درج کر رکھی ہوں گی۔ . . . . نسخۂ حمیدیہ نو دریافت مخطوطے کی نقل نہیں بلکہ کسی

---

[1] نسخۂ شیرانی اور دوسرے مقالات (قدرت اللہ نقوی) صفحہ [illegible]

اور دیوان کی ہے۔ میرے خیال میں غیر مردف دیوان سے کوئی نسخہ تیار کیا گیا جس کی یہ نقل ہے۔

اسی عہد کے لگ بھگ تیار ہونے والے ایک نسخہ کے متعلق غالب نے کلکتہ سے محمد علی خاں کو ایک خط میں لکھا ہے:

"دیوان ریختہ کہ گرد آوردن آں را بیش از ہفت سال گذشتہ و معہذا ہرے از موا ہیرایں روسیاہ کہ اسد اللہ خان عرف میرزا نوشہ نقش نگین و جلوۂ سال یک ہزار و دو صد و سی و یک ہجری طراز دامن و آستینش بود بر خاتمہ اوراق سفینہ رقم"۔ (نامہ ہائے فارسی غالب صفحہ ۱۰۲)

"یہ ۱۸۲۸ء کا واقعہ ہے، اس میں سے سات سال کی مدت گھٹائی جائے تو یہ ۱۸۲۱ء کے لگ بھگ کا زمانہ ہوگا۔ لہٰذا وہ دیوان وہی ہوگا جس کی نقل نسخۂ حمیدیہ ہے لیکن گلِ رعنا کا انتخاب دلالت کرتا ہے کہ مذکورہ نسخے کے علاوہ ایک نسخہ اور بھی غالب کے ساتھ تھا جو نسخۂ شیرانی کے مطابق تھا۔"[1] اور نسخۂ شیرانی کے زیرِ عنوان ان کا یہ اقتباس قابلِ توجہ ہے:۔

"....حاشیے کی ایک غزل بقلم غالب ہے۔ متعدد مقامات پر ترامیم ملتی ہیں اور حک و اصلاح کا عمل ہوا ہے بعض اصلاحیں بہ قلم غالب ہی تسلیم کی گئی ہیں۔ رسم الخط خوشخط نستعلیق ہے۔ حاشیہ بھی اسی قلم سے ہے مگر باریک۔ نسخۂ حمیدیہ سے اس نسخے کی غزلیات اور اشعار کی ترتیب کا اختلاف اتنا زیادہ ہے کہ کسی طرح بھی اس نسخے کو نسخۂ حمیدیہ کی نقل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نیز یہ کہ وہ نسخہ جو غالب نے کلکتہ میں نام و تخلص کے ثبوت کے لیے پیش کیا تھا وہ اگر وہی نسخہ تھا جس سے گلِ رعنا کا انتخاب عمل میں آیا تو وہ ۱۸۲۱ء کا

[1] گلِ رعنا مع آشتی نامۂ غالب" مرتبہ سید قدرت اللہ نقوی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ ۱۹۷۵ء۔ صفحہ ۱۴۔

ممکن یہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں وہ کلام بھی منتخب ہوا ہے جو بعد میں کہا گیا ہے اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ترامیم اور اضافے اس میں کر لیے گئے تھے تو ترتیبِ غزلیات و اشعار کا اختلاف اس کی تائید نہیں کرتا۔ احساس یہ ہے کہ سفرِ کلکتہ میں غالب کے ساتھ دو نسخے تھے ایک وہ جس سے نسخۂ حمیدیہ نقل ہوا، دوسرا وہ جس سے نسخۂ شیرانی تیار ہوا....[1]

میں نے "نسخۂ شیرانی" پر مقالہ لکھنے سے پہلے یہ سوچا تھا کہ اپنے اس مقالے میں مندرجۂ ذیل امور زیرِ بحث لاؤں گا۔

۱۔ نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی میں کیا ربط باہم ہے۔

۲۔ نسخۂ شیرانی کی افادیت اور اہمیت، مثلاً یہ کہ نسخۂ حمیدیہ کی یہ حیثیت مشکوک ہے کہ اسے غالب نے دیکھا یا نہیں اور اس لحاظ سے نسخۂ شیرانی کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے کہ یہ غالب کا دیکھا ہوا ہے، غالب کے دیوان کو تاریخی ترتیب سے مرتب کرنے کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے ورنہ gap پڑ جاتا ہے۔

اس نسخے کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ حمیدیہ کے بعد کلام میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ یہ نسخہ غالب کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ مثلاً یہ غزل دیکھیے۔

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو

جو نسخۂ شیرانی کے صفحہ ۵۶۔ ا کے حاشیے میں درج ہے۔ اس کے آخر میں ایک قطعہ ہے جو متداول دیوان میں یوں ہے۔

[1] گلِ رعنا مع آشتی نامۂ غالب" مرتبہ سید قدرت اللہ نقوی انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ ۱۹۷۵ء۔ صفحہ ۱۵-۱۶۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی — ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر — عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ — جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

نسخۂ شیرانی کے حاشیے میں پہلے شعر کا مصرعِ اول یوں ہے۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا غالبؔ

اور دوسرا اور تیسرا شعر یہ ہے۔

طاقتِ رنجِ سفر بھی نہیں پاتے اتنی — ہجرِ یارانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی امید — جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

یہ غزل انھوں نے کلکتے جاتے ہوئے کہی۔ لکھنؤ میں ان کے پروگرام میں نواب معتمد الدولہ بہادر سے ملاقات شامل تھی لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ غالب نے ملاقات کیلئے چند شرطیں عائد کر دیں مثلاً نواب صاحب معانقہ کریں گے، مجھے نذر پیش کرنے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ یہ شرطیں نواب صاحب کو قابلِ قبول نہ تھیں ملاقات نہ ہو سکی، اور غالب ملاقات کیے بغیر لکھنؤ سے باندہ روانہ ہو گئے۔ لکھنؤ ہی میں (جب ملاقات ختم ہو گئی) یا لکھنؤ سے روانہ ہونے کے بعد انھوں نے قطعے میں سے "طاقتِ رنجِ سفر" اور "معتمد الدولہ بہادر" والے دونوں شعر خارج کر دیئے۔ پہلے مصرعے سے اپنا تخلص نکال دیا اور قطعے کو وہ صورت دی جو متداول دیوان میں درج ہے اور جو اوپر بھی نقل کیا گیا ہے۔ یہ غزل بھی انھوں نے لکھنؤ یا باندہ سے لکھ کر اپنے اس قریبی عزیز یا دوست کو بھیجی جس کے پاس وہ نسخہ تھا جس کو ہم اب نسخۂ شیرانی کہتے ہیں۔

مذکورہ قطعے سے غالب کی اس مزاجی کیفیت پر روشنی پڑتی ہے جسے خودداری

یا انا کہا جاتا ہے اور جس کا ذکر ہم دہلی کالج والے واقعے کے تعلق سے کرتے ہیں۔ یہ قطعہ بھی اسی مزاجی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔

۳۔ نسخۂ شیرانی کا کاتب غیر محتاط ہے، نقطوں کے معاملے میں (نقطوں کو خود غالب نے درست کیا ہے۔)

۴۔ یہ نسخہ کسی بڑے آدمی کے لیے تیار کیا گیا ہوگا؟ (کیونکہ اس کی تیاری میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے) کلکتہ روانہ ہونے سے پہلے یہ مکمل ہو چکا تھا۔

۵۔ غالب نے اپنے اشعار میں جو ترمیم یا اصلاح کی ہے، اسکی قدر و قیمت کیا ہے یعنی کیا اس تبدیلی سے شعر بہتر ہو گیا ہے یا ویسا ہی رہا ہے یا اس کا مرتبہ پہلے سے کم ہو گیا ہے۔ (میں نے خود شاعر کے قلم سے ترمیم و اصلاح کے پیشِ نظر علامہ اقبال کے کلام کو غائر نظر سے دیکھا ہے اور "اقبال کے اپنے کلام پر نظرِ ثانی" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا ہے۔ اس میں اپنے اندازے سے میں نے یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال نے یہ تبدیلی کس خیال سے کی ہوگی۔ اسی طرح کا ایک حصہ اس مضمون میں ان تمام ترامیم اور اصلاحوں کیلئے بھی میرے پیشِ نظر تھا جسکی شمولیت اس مقالے میں ضروری تھی)

۶۔ اس مقالے میں ان تمام اشعار کا حوالہ دینا بھی ضروری تھا جنکے اشعار کا متن حمیدیہ (اصل) کے متن سے مختلف ہے۔ ان اہم ترامیم کا تفصیلی ذکر بھی ضروری تھا جو شیرانی میں ہیں مگر حمیدیہ میں نہیں ہیں۔

لیکن بحث کا پہلا حصہ ہی یعنی نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی کا ربط باہم ہی اتنا طویل ہو گیا کہ اگر دوسرے مذکورہ ابعاد پر لکھنے کی میں کوشش کرتا تو بر بنائے طوالت مکمل مقالہ یہاں پیش کرنا دشوار ہو جاتا۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ اہلِ علم کی نظر سے یہ تمام ابعاد مخفی نہیں ہونگے اور نسخۂ شیرانی کے سلسلے میں ان ابعاد پر ضرور لکھا جائے گا۔ اور چونکہ مقالہ صرف ایک ہی بُعد تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اس لیے میں نے اس کے عنوان میں ذرا سا اضافہ کر کے اسے محدود کر دیا ہے یعنی "نسخۂ حمیدیہ سے نسخۂ شیرانی تک۔"

رامائن اور مسلمان

از

جناب رام لعل نابھوی صاحب، نابھا، پنجاب

معارف دسمبر ۲۰۰۸ء کے شمارہ میں اخبار علمیہ کے زیر عنوان عربی، فارسی، اردو کی رامائنوں کا ذکر "ٹائمز آف انڈیا" میں میرے انٹرویو کے ضمن میں کیا گیا ہے۔

دوران مطالعہ مجھے ایسی کتابیں، ایسے تذکرے اور ایسے مخطوطات کی فہرستیں دیکھنے کو ملیں، جن سے یہ پتہ چلا کہ سیکڑوں کتابیں ایسی ہیں، جو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوئیں، اس مضمون میں صرف ان رامائنوں کا ذکر ہوگا جو صرف مسلم دانشوروں نے عربی، فارسی، اردو، پنجابی، بحروف فارسی، انگریزی، ہریانوی میں لکھیں، اور ایسے چالیس ۴۰ مسلم شاعروں کا ذکر ہوگا جنھوں نے رام اور رامائن پر نظمیں لکھیں، کچھ ایسی رامائنیں بھی ہیں جن کا آغاز اور انجام نہیں، اور مصنف کے نام کا پتہ نہیں لگ سکا، اور با تصویر فارسی کی ایک ایسی رامائن کا ذکر پتا ہک ہندوستان میں ہوا جو اکبر کے زمانہ میں تیار ہوئی، مضمون نگار نے مصنف کا ذکر نہیں کیا، اور بڑی کوشش پر بھی مجھے اس رامائن کا دوسرا صفحہ دستیاب نہیں ہوا، "رام کتھا اور مسلم ساہتیہ کار" ہندی میں پنڈت بدری ناتھ تیواری نے شائع کی ہے جو ڈھائی سائز کے ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہے، "ادب لطیف" لاہور کے رام نمبر میں ایک ایسا مخطوطہ بھی طلب ہے جسے چندر من بلالی نے لکھا، لیکن غلط طور پر عبدالقادر بیدل کے نام سے منسوب ہوگیا، یہ مخطوطہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں ہے۔

ایک زمانہ تھا جب ہندو شعراء اور ادباء اپنی کتاب بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع کرتے تھے، پھر حمد کہتے، نعت اور منقبت کہتے، محفل میلاد میں یا مرثیہ خوانی ان میں ایسے شرکت کرتے جیسے یہ ان کے تہوار ہوں، مسلم دانشوروں نے رامائن کے علاوہ مہابھارت اور گیتا، جپ جی، سکھمنی صاحب وغیرہ کے ترجمے کیے، دیوالی، ہولی میں برابر شرکت کرتے، سکھوں کے سب سے بڑے ہرمندر صاحب کا سنگ بنیاد میاں میر رکھتے، اور پیروں فقیروں کے مزاروں کے مجاور ہندو ہوتے، یوں تو یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے، لیکن وہی بات اگر ہندو دانشوروں سے رہتی تو حکومتیں جو قومی یکجہتی کے نام پر لاکھوں روپیہ برباد کر رہی ہیں، اور ضروری کاموں پر صرف ہوتا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے "فارسی ادبیات میں ہندوؤں کا حصہ" مقالہ لکھا، اسے اولیت بھی حاصل ہے، اور جامعیت بھی، مرحوم سید عبداللہ کے بعد ڈاکٹر زرینہ رہباد رسری واستو نے اپنا مقالہ "مغلیہ عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگ دان" شائع کیا، اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے "دانش" اسلام آباد کے شمارہ نمبر ۹ میں مدیر عارف نوشاہی لکھتے ہیں:

"جب بات ہند و پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ نویسی کی ہو تو ہم ہندوؤں کو نظر انداز نہیں کر سکتے، جنھوں نے مغل اور مابعد مغل عہد کی اسلامی تہذیب کے دھارے میں شامل ہو کر فارسی کو ہندوستانی ادب کی زبان کی حیثیت سے اپنایا، اور اسے اپنے افکار کے لیے ابلاغ کا ذریعہ بنایا، ہنود کی فارسی ادب کے لیے خدمات کے تذکرہ پر ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی کتاب "فارسی ادبیات میں ہندوؤں کا حصہ" کو اولیت بھی حاصل ہے اور جامعیت بھی، مگر جوں جوں نئے مآخذ سامنے آرہے ہیں اس موضوع پر نئے سرے سے کام کرنے کی ضرورت بڑھ رہی ہے، میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ صرف پاکستانی کتب خانوں میں ہندوؤں کے فارسی آثار اس کثیر تعداد میں موجود ہیں کہ اگر ان سب کا کسی الگ کتاب میں تنقیدی جائزہ لے لیا جائے تو ڈاکٹر عبداللہ مرحوم کی کتاب اس نئے کام کا ایک دیباچہ

معلوم ہوگی، میرا مقصد کسی طرح بھی مرحوم کے کام کی اہمیت کو گھٹانا نہیں، بلکہ صرف یہ یاد دلانا ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس موضوع میں توسیع و تکمیل کی اب خاطر خواہ گنجائش پیدا ہو چکی ہے"

چندر بھان برہمن پر کچھ کتابیں مسلم دانشوروں کی ملتی ہیں، ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے اپنی تازہ کتاب "پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ" میں ہندوؤں کے فارسی ادب کا ذکر تفصیل سے کیا ہے، چنانچہ میں نے بھی ایک کاوش کی ہے، میرے ذرائع بھی محدود ہیں اور میری تعلیم بھی مختصر ہے، امید کرتا ہوں کہ یہ ایک نیا سلسلہ اور نئی باتیں لائے گا، اور دانشور اس طرف توجہ دیں گے، آج ملک کو ایسے ادب کی سخت ضرورت ہے۔

ذیل میں عربی، فارسی اور انگریزی کے علاوہ خود اس ملک کی مختلف زبانوں میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی رامائنوں کی فہرست دی جاتی ہے، اس کے آخر میں رام پر نظمیں کہنے والے مسلمان شعراء کا ذکر ہوگا۔

فہرست عربی، فارسی، اردو، پنجابی بحروف فارسی، ہریانوی، انگریزی رامائنوں کی، جنھیں مسلم دانشوروں نے لکھا اور نام ایسے مسلم شعراء کے جنھوں نے رام کے گیت گائے:

نمبر شمار	نام رامائن	نام مصنف یا مترجم	زبان	مخطوطہ یا مطبوعہ	سال طباعت نام پریس	تاریخ مخطوطہ	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۱	ملحمة راما	بستانی لبنانی	عربی	مخطوطہ			۳۰۸	بڑا	منظوم	مولانا ابوالکلام آزاد کے ایما پر یہ نسخہ تیار ہوا انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز میں موجود ہے
۲	رامایانا		عربی	مطبوعہ باتصویر	۱۹۸۶ء بمبئی میں چھپا		۹۹	کتابی	منثور	انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز نے شائع کیا
۳	رامائن	عبدالقادر بدایونی	فارسی	مخطوطہ					منثور	قلمی نسخہ پاکستان میں ہے

نمبر شمار	نام رامائن	نام مصنف یا مترجم	زبان	مخطوطہ یا مطبوعہ	سال طباعت نام پریس	تاریخ مخطوطہ	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
										دیکھیے نسخہ ہائے خطی فارسی جلد چہارم ص ۲۱۵۵ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان۔ یہ رامائن اکبر کے دور میں لکھوائی گئی کچھ ذکر دربار اکبری از محمد حسین آزاد ص [illegible] میں ہے۔ فارسی رامائن از عبدالودود پروفیسر شعبۂ فارسی جواہر لال یونیورسٹی دہلی میں موجود ہے اور قلمی نسخے بھی ہیں
۴	ترجمہ رامائن	فیضی فیاضی	فارسی	مخطوطہ		۱۰۵۴ھ			منثور	یہ نسخہ کتب خانہ ندوہ میں محفوظ ہے دیکھیے فہرست ہائے نسخہ خطی فارسی کتب خانہ ندوہ لکھنؤ، مرکز تحقیقات فارسی [illegible]
۵	رامائن وظیفۂ فیضی	فیضی	فارسی	مخطوطہ					منثور	یہ نسخہ پاکستان میں ہے دیکھیے نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان جلد دوم مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ص ۲۱۵۹
۶	رامائن مسیحی	ملا مسیح کیرانوی	فارسی	مخطوطہ اور مطبوعہ	نول کشور ۱۸۹۹ء		۳۳۱	بڑا	منظوم	مخطوطات مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، برٹش میوزیم، انڈیا آفس لائبریری، [illegible] کتب خانہ، بانکی پور کتب خانہ، ایشیاٹک سوسائٹی، سنٹرل لائبریری پٹیالہ کے علاوہ پاکستان میں بہت سے نسخے ہیں
۷	رام چند	میر شمس الدین فقیر	فارسی	مخطوطہ		۱۲ ویں صدی ہجری		۸×۲۰-۳۰×۲۰		مخطوطہ خدا بخش لائبریری میں ہے دیکھیے مرآۃ العلوم ج [illegible] خدا بخش لائبریری پٹنہ

نمبر شمار	نام رامائن	نام مصنف یا مترجم	زبان	مخطوطہ یا مطبوعہ	سال طباعت و نام پریس	تاریخ مخطوطہ	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۸	اشعار شعرائے فارسی واردہ	میر شمس الدین فقیر	فارسی	مخطوطہ		۱۳ ویں صدی ہجری		۲۰ × ۳۰ / ۲۰ × ۸		مخطوطہ خدا بخش لائبریری میں ہے
۹	رامائن		〃	〃		۱۲ ویں صدی ہجری		۲۵×۱۸ / ۱۹×۱۰	منظوم	〃
۱۰	رام و سیتا	مسیحائے کاشی	〃	〃		〃		۱۶ × ۲۲	منظوم	〃
۱۱	رامائن	ابو الفضل	〃	〃						دیکھیے نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان جلد ششم ص ۱۴۵ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان
۱۲	رامائن	غلام رسول	〃	〃						مخطوطہ آرکائیوز ڈیپارٹمنٹ پنجاب میں ہے نمبر M/460 ہے
۱۳	مختصر رامائن	اقبال نعمانی	〃	مطبوعہ	ایران میں چھپی		۱۱۲	کتابی	منثور	یہ رامائن پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ میں موجود ہے
۱۴	رامائن	عبدالودود اظہر	〃	〃	ایران میں دو جلدوں میں چھپی		۴۹۶ + ۴۶۰	بڑا	〃	
۱۵	فرخ نامہ (رامائن)	ترکی نور علی	〃						منظوم	مہاراجہ ہیرا سنگھ والی ریاست نابھہ نے یہ رامائن لکھوائی، چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے جس میں منصبیات ملا [illegible] دیکھیے مضمون ترکی نور علی "آج کل" مارچ ۱۹۶۰ء تکمیلی علمی و ادبستانی دکن حیدرآباد ص ۱۲۳، از قادری زور

نمبر شمار	نام رامائن	نام مصنف یا مترجم	زبان	مخطوطہ یا مطبوعہ	سال طباعت و نام پریس	تاریخ مخطوطہ	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۱۶	رامائن	ولی اللہ سلفی	انگریزی	مخطوطہ			ٹائپ صفحات ۱۵۴ ب	بڑا	منثور	ولی اللہ سلفی پٹنہ کا رامائن میکی پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے
۱۷	رامائن	نفیس خلیلی	اردو	مطبوعہ				چھوٹا	منظوم	اس کتاب کے دو ایڈیشن چھپے
۱۸	مثنوی رامائن	محمد امتیاز الدین	اردو	مطبوعہ				ڈھائی	منظوم	
۱۹	رامائن کے بعض سین	عبدالستار	اردو	مطبوعہ						
۲۰	سیتا بن باس	آغا حشر کشمیری	اردو	مطبوعہ						
۲۱	رام چرتر مانس	نور الحسن نقوی	اردو	مطبوعہ						
۲۲	مقامات رامائن	علی جواد زیدی	اردو							

نمبر شمار	نام رامائن	نام مصنف یا مترجم	زبان	مخطوطہ یا مطبوعہ	مقام مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۲۳	بھگوی داس اور رام چرت مانس	صفدر زادہ	اردو	مطبوعہ					منثور	
۲۴	رام کتھا سندر کانڈ	حفیظ اللہ خان	اردو							
۲۵	رامائن	بیدی نظمی	اردو	مطبوعہ						
۲۶	رامائن	احمد بخش تھانیسری	ہریانوی	مطبوعہ ہندی لپی میں					منظوم	ساہتیہ اکادمی ہریانہ نے شائع کی ہے
۲۷	رامائن	عبدالحسان	پنجابی	مخطوطہ پنجابی فارسی رسم الخط میں					منظوم	پاکستان میں ہے دیکھیے رسالہ کھوج قلمی نسخہ نمبر۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور

اب ان مسلمان شعراء کے نام ملاحظہ ہوں جنھوں نے رام کی عظمت کے گن گائے ہیں :

۱۔ ابراہیم عادل شاہ
۲۔ حضرت علی حزیں
۳۔ سعادت یار خاں رنگین
۴۔ اقبال
۵۔ ظفر علی خان
۶۔ احسان دانش
۷۔ ساغر نظامی
۸۔ وقار انبالوی
۹۔ امیر احسنی گنوری
۱۰۔ جان نثار اختر
۱۱۔ نازش پرتاپ گڈھی
۱۲۔ حالی
۱۳۔ جوش ملیح آبادی
۱۴۔ اسرار الحق مجاز
۱۵۔ غلام ربانی تاباں
۱۶۔ عاصم بریلوی
۱۷۔ رضا امروہی
۱۸۔ محمد محمود رضوی
۱۹۔ سالک عزیزی
۲۰۔ حرمت الاکرام
۲۱۔ احمد علی خاں منصور
۲۲۔ حفیظ بنارسی
۲۳۔ مسرور اورنگ آبادی
۲۴۔ ریاضت علی شائق
۲۵۔ نادم بلخی
۲۶۔ فرحت القادری
۲۷۔ ضیاءالدین اکمل
۲۸۔ غلام قادر فرخ
۲۹۔ فیاض گوالیاری
۳۰۔ محمد بدرالدین بدر
۳۱۔ نفیس خلیلی
۳۲۔ رفعت سروش
۳۳۔ سلطان اختر
۳۴۔ مظفر حنفی
۳۵۔ افضل جعفری
۳۶۔ سلام سندیلوی
۳۷۔ سکندر علی وجد
۳۸۔ علی جواد زیدی
۳۹۔ شاد عارفی
۴۰۔ عادل منصوری
۴۱۔ حیات وارثی
۴۲۔ نظیر اکبر آبادی
۴۳۔ نذیر بنارسی
۴۴۔ سرور جہتری

...

اخبارِ علمیہ

بیروت کے ایک علمی ادارہ مرکز الخدمات والابحاث الثقافیہ سے ایک بلند پایہ علمی و تحقیقی رسالہ المعتمد کے نام سے شایع ہوا ہے، اس کا خاص مقصد اہم اسلامی مخطوطات کو ایڈٹ کر کے شایع کرنا ہے تاکہ مراجع کی تصحیح کے بعد مستشرقین کی غلط تحریروں کا رد ہوسکے۔ زیر نظر شمارہ میں مرکز کے عربی و مشرقی مخطوطات کی فہرست، تحفۃ المودود فی المقصور والممدود للامام جمال الدین محمد بن عبداللہ متوفی ۶۷۲ھ، طبرانی کی الاربعون البلدانیہ المخرجہ من المعجم الصغیر، علمائے بیروت کے تذکرہ میں مصطفیٰ نجا مفتی بیروت، قرآن مجید و علوم قرآن کے اہم علمی مصادر اور ترکی کے اسلامی ادب کے مخطوطات کے مراکز جیسے اہم مضامین شامل ہیں، رسالہ کے مدیر عبداللہ عمر البارودی ہیں، رسالہ کا ظاہری جمال اس کے معنوی حسن کے عین مطابق ہے۔

بیروت کی مجمع العلمی الاسلامی کے زیر اہتمام، قرآن مجید کے نادر مخطوطات کی ایک نمائش حال ہی میں ابوظبی میں ہوئی، اس میں لندن میوزیم میں محفوظ قرآن مجید کا ایک نادر ترین نسخہ بھی پیش کیا گیا، یہ نسخہ ۵۰۰ برس پرانا یعنی عہد عباسی کے اواخر کا ہے اور اپنے زمانہ کے مشہور خطاط احمد القرہ حصاری کا لکھا ہوا ہے، مجمع العربی نے اس نفیس و نایاب نسخہ کی طباعت کا اہتمام بھی کیا، ۷۰۰ صفحات کے اس قرآن مجید کی طباعت ۱۵ برس میں ہوئی اور ایک ایک جلد پر ایک لاکھ ڈالر کی رقم خرچ ہوئی، کل ۵۰۰ جلدیں طبع ہوئیں، اس میں ایسا کاغذ استعمال کیا گیا ہے جس پر برسوں کسی قسم کے کیڑوں، موسمی اثرات بلکہ کتابوں کی بربادی کے تمام اسباب کا اثر نہ ہوگا، طباعت میں ۱۵ رنگوں کا استعمال ہوا ہے اور یہ رنگین روشنائیاں جرمنی میں خاص طور پر تیار کی گئیں، انکے علاوہ ۲۴ قیراط سونے کا بھی استعمال ہوا ہے اور جلد بندی شتر مرغ کی کھال سے کی گئی ہے۔ مجمع العلمی نے اس مطبوعہ شاہکار کو پیرس کے لوفر میوزیم میں بھی نمائش کے لیے پیش کیا ہے۔

قرآن مجید کے چینی ترجمہ کی دس ہزار کاپیوں کو موتمر عالم اسلامی نے چین میں تقسیم کیا ہے، چین میں اسلامیات کے فروغ کیلئے موتمر نے ممبروں کی ایک کمیٹی بھی بنائی ہے جسکے چیرمین سابق سعودی وزیر اطلاعات ڈاکٹر محمد عبدہ یمانی ہیں۔

ایک طرف تو قرآن مجید اور قرآنی علوم کی تبلیغ و اشاعت کا مبارک کام ہو رہا ہے دوسری جانب مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کی شیطانی کوششیں بھی جاری ہیں، اب قبرص کے ایک مشنری گروپ نے حضرت عیسیٰ پر ایک کتاب "سیرۃ المسیح بلسان العربی الفصیح" کے نام سے شایع کی ہے، لیکن کتاب میں سیرت مسیح پر کم اور مسلمانوں پر بہتان طرازی پر زیادہ زور دیا گیا ہے، اسلام کے مقدس و محترم ترین شعائر پر لاف زنی کی گئی ہے اور شکوک و شبہات پیدا کر کے قرآن مجید کی تنقیص و تحریف کی نئی سازش کی گئی ہے، "ٹائمز آف انڈیا" کی خبر کے مطابق یہ کتاب عمداً قرآن مجید کے طرز پر لکھی گئی ہے اس کا ہر باب بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ سے شروع ہوتا ہے، آیات قرآنی کی مشابہت میں اس میں بھی ہم وزن اور ہم قافیہ اور رواں عبارتیں شاید اس غرض سے شامل کی گئی ہیں کہ ان کو پڑھنے اور حفظ کرنے میں آسانی ہو، موتمر عالم اسلامی نے اس کتاب کی شدید مذمت کی ہے اور اس کے خلاف سخت تنبیہ بھی کی ہے۔

روس کی موجودہ آرمینیائی حکومت، ترکی کی خلافت عثمانی پر مسلسل مختلف الزامات لگاتی رہی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ترکوں نے اپنے عہد حکومت میں آرمینیوں کا استحصال کیا، اب ترکی کی حکومت نے ۱۶۹۱ء سے ۱۸۹۵ء تک کی تمام قدیم دستاویزوں کو جمع کر لیا ہے، ان کی تبویب و تدوین بھی مکمل ہوگئی ہے ترکی کی وزارت خارجہ کا ارادہ ہے کہ ۱۹۲۳ء تک کی اور تمام دستاویزیں بھی مرتب کر لی جائیں، خیال ہے کہ اپریل میں کم از کم ۱۸۹۵ء تک کی دستاویزیں محققین کے سامنے پیش کر دی جائیں گی اور اس کے بعد عہد خلافت عثمانی کے بعض نہایت اہم اور قیمتی واقعات و معلومات سے علمی دنیا مستفید ہو سکے گی۔

برطانیہ کی وزارت داخلہ کے ۱۲۰۰۰۰ پونڈ کے گراں قدر عطیہ کی مدد سے چرچ برطانیہ، ایک نیا اطلاعاتی ادارہ قائم کر رہا ہے، مقصد یہ ہے کہ برطانیہ میں دوسرے مذاہب اور جدید مذہبی تحریکوں کے متعلق حقیقی، واقعی، غیر جانبدارانہ اور تعصب سے پاک معلومات فراہم کیے جائیں، لیکن اندیشہ یہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اس سے خود چرچ کی حیثیت کو نقصان پہنچے گا، کیونکہ ان کا تعصب اور دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں ان کا حریفانہ و رقیبانہ رویہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

(ع۔ ص)

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۸۸ء (انجمن طلبۂ مدرسۃ الاصلاح) مدیر مقصود احمد اعظمی، صفحات ۲۲۵، قیمت ۲۵ روپیے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، ناشر انجمن طلبۂ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڈھ۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڈھ ایک معروف درسگاہ ہے جو مولانا حمید الدین فراہیؒ کے نظریات وافکار کے مطابق، تعلیم وتربیت کے لیے خاص طور پر شہرت رکھتی ہے۔ اس کی طرف سے ماہنامہ الاصلاح، مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی کی ادارت میں ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۰ء شایع ہوتا رہا، اس کے بعد مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی کی ادارت میں اصلاح کے چند نمبر اور بھی شایع ہوئے، اب ایک طویل مدت کے بعد، اسی ادارہ کے طلبہ نے اپنے اساتذہ کی رہنمائی میں اپنا یہ سالانہ مجلہ شایع کیا ہے، اس میں پہلے مختلف اہل علم کے پیغامات درج ہیں پھر طلبہ کی انجمن اور اس کے مختلف شعبوں کے بارہ میں اکابر علماء اور مشاہیر کے تاثرات درج کیے ہیں اور اس کے بعد مختلف مضامین ہیں جن کو تدبر قرآن، تدبر حدیث، فقہ واجتہاد، بحث ونظر، شخصیات، تاریخ ادب، دعوت دین، یادرفتگاں، عالم خیال اور ادبیات کے ذیلی حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ دو ایک کے سوا تمام مضامین طلبہ ہی کے قلم سے ہیں، مدرسۃ الاصلاح کے بانی مولانا محمد شفیع ایک

صالح اور متقی بزرگ تھے، اس مجلہ میں ان پر بھی کوئی مضمون ہوتا تو بہتر تھا، ایک جگہ یہ فقرہ بھی نظر سے گذرا کہ الاصلاح، علامہ شبلیؒ ..... کے خوابوں کی ایک صحیح تعبیر ہے (ص ۷) اس لیے مولانا شبلیؒ پر بھی اس مجلہ میں کوئی مضمون ہوتا تو اس سے یہ سمجھنے میں مدد ملتی کہ مولانا شبلیؒ کے نظریۂ تعلیم کو اس درسگاہ میں کس حد تک نافذ کیا گیا ہے، موجودہ صورت میں بھی جو مضامین اس شمارہ کی زینت ہیں ان سے اور عربی وانگریزی کے مضامین سے طلبہ کے صاف ستھرے علمی ذوق ومطالعہ اور بہتر صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے ان کا مطالعہ عام قارئین کے لیے بھی مفید ہوگا۔

ضیا ۱۹۸۸ء (خاص شمارہ) **مدیر محمد یونس فلاحی**، صفحات ۲۲۴، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، قیمت ندارد، ناشر طلبۂ سرضیاء الدین ہال، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ۔

یہ خاص شمارہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے سرضیاء الدین ہال کے طلبہ کا ترجمان ہے، جو طلبہ کے علاوہ یونیورسٹی کے فاضل اساتذہ کے پُر مغز مضامین سے بھی مزین ہے، طلبہ کے مضامین اور ان کی شعری کاوشوں سے ان کے اچھے علمی وادبی مذاق اور درخشاں مستقبل کی نشاندہی ہوتی ہے۔ دوسرے اہل علم کے جو مضامین ہیں ان سے بھی یہ مجلہ، علی گڈھ کے روایتی معیار اور متنوع ذوق کا نمائندہ بن گیا ہے اس لیے ان کا مطالعہ علمی وادبی حلقوں کے لیے بھی فائدہ سے خالی نہیں۔

سرسید ہال ریویو ۱۹۸۷ء، ایڈیٹر صفدر سلطان اصلاحی، صفحات ۲۲۴، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، پتہ: سرسید ہال نارتھ، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ۔

یہ خاص شمارہ، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے سرسید ہال کے طلبہ کا ترجمان ہے، ابتداء میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور دوسرے ذمہ داروں کے پیغامات ہیں۔ یونیورسٹی کے اساتذہ میں سے ڈاکٹر ظفر الاسلام، ڈاکٹر انصار اللہ،

اور ڈاکٹر اصغر عباس کے مضامین بیت المال اور سماجی تحفظ، اردو قواعد کے بعض مسائل یہ خاک ہے جس کا جنوں صیقل ادراک، خاص طور پر لائق مطالعہ ہیں، مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں (از ڈاکٹر نعیم احمد) دلی اللٰہی تحریک (محمد ارشد خاں) طب یونانی روبروے طب جدید (از محمد عارف اصلاحی) جدید عربی کا اہم شاعر۔ ابراہیم ناجی (از ابو سفیان اصلاحی) کتبۂ اسکندریہ کی تباہی (ترجمہ و تلخیص حسن حبیب فلاحی) بھی مفید اور قابل قدر مضامین ہیں، اور مضامین بھی افادیت سے خالی نہیں، بحیثیت مجموعی یہ مجلہ خاص، عام شائقین کے لیے بھی شوق اور دلچسپی سے پڑھنے کی چیز ہے۔

ارمغان سیفیہ مرتبہ جناب عبد القوی دسنوی و محمد نعمان، ۲۷،۸، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، قیمت درج نہیں، ناشر: شعبۂ اردو، سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج بھوپال،

پروفیسر عبد القوی دسنوی (صدر شعبۂ اردو سیفیہ کالج) اپنے شعبہ کیطرف سے ادبی و علمی موضوعات پر مفید کتابیں اور مجلات برابر شایع کرتے رہے ہیں، یہ مجلہ بھی انکی محنت و کاوش کا نتیجہ اور ایک خوبصورت ادبی تحفہ ہے، اسمیں پہلے وسط ہند کے سرسید اور سیفیہ کالج کے بانی ملا سجاد حسین اور انکے خلف ارشد ملا فخر الدین کی خدمات اور کالج کے مختلف شعبوں کی روداد تحریر کی گئی ہے" اردو زبان، سیفیہ کالج اور بھوپال" کیفی اعظمی کیساتھ ایک صبح" "ایک یادگار سپاسنامہ" (فیض کی خدمت میں) فیض احمد فیض اور مادر علمی سیفیہ کالج، "تذکرہ سیفیہ" ہاکی اور سیفیہ" وغیرہ متنوع مضامین کے علاوہ" قصر سلطانی میں ایک شام" کی تفصیل دی ہے جسمیں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایک یادگار تصویر اور جناب صباح الدین عبد الرحمن مرحوم اور ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے تاثرات کو شامل کرکے اس یادگار تاریخی تقریب کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔ صالحہ عابد حسین، ظہیر احمد صدیقی، شفیق خواجہ سید حامد حسین، ابراہیم یوسف، حکیم سید ظل الرحمن، اقبال مسعود ندوی اور ڈاکٹر قاسم نیازی کے مضامین سے بھوپال کے علمی، ادبی، تاریخی اور تہذیبی نقوش نمایاں ہوتے ہیں، آخر میں بھوپال کے بدنام زمانہ گیس المیہ پر چند نظمیں اور ایک مضمون بھی ہیں، یہ مجلہ علمی و ادبی حیثیت سے دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے۔

ع ۔ ک

مطبوعات جدیدہ

سیرت احمد مجتبیٰ صلے اللہ علیہ وسلم ظہور قدسی سے مسجد قبا تک مرتبہ جناب شاہ مصباح الدین صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہت عمدہ، صفحات ۵۶۲ مجلد مع خوبصورت گردپوش، قیمت ۵۰ روپیے ناشر: پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی لمیٹڈ، داؤد سینٹر، مولوی تمیز الدین خاں روڈ۔ کراچی۔ پاکستان

سیرت نبوی مسلمانوں کا محبوب موضوع ہے، دنیا کی تمام زبانوں کی طرح اردو میں بھی اس پر تصنیفات کا نا مختتم سلسلہ جاری ہے، زیر نظر کتاب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے واقعات و حالات تحریر کیے گئے ہیں، سلیس و شگفتہ زبان اور موثر و دلنشیں پیرایہ بیان کے علاوہ اس کی ترتیب و تبویب سے بھی مصنف کی خوش مذاقی اور سلیقہ تحریر کا پتہ چلتا ہے، برمحل مصرعوں یا معنی خیز فقروں اور جملوں کو ذیلی عنوان بنا کر انھوں نے اس کتاب میں منفرد اور دلآویز رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اس کی ایک نمایاں خصوصیت وہ نقشے بھی ہیں جو مختلف جگہوں کے اس میں دیے گئے ہیں، ایک نامۂ مبارک کا عکس بھی دیا ہے، حسن طباعت سب پر مستزاد ہے، ابتدا ملک عرب کے مختصر جغرافیائی اور معاشرتی و سیاسی حالات سے کی گئی ہے، پھر آپ کی ولادت سے ہجرت یعنی مکہ سے روانہ ہوکر قبا تک پہنچنے کی تفصیل قلمبند کی گئی ہے، معراج پر اچھی بحث کی ہے، مجموعی حیثیت سے یہ اچھی اور مفید کتاب ہے مگر مصنف نے روایات میں زیادہ چھان بین اور احتیاط کے بجائے عام اصول کے مطابق فضائل کی روایتوں میں توسع سے کام لیا ہے۔

رپورٹ تیسری انڈین نیشنل کانگریس، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی صفحات ۴۴۸ مجلد مع گرد پوش قیمت ۲۴ روپیے، ناشر اتر پردیش اردو اکاڈمی، بلہرہ ہاؤس، قیصر باغ، لکھنؤ۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی نے انڈین نیشنل کانگریس کی صد سالہ یادگار کے سلسلہ میں یہ کتاب شایع کی ہے، یہ کانگریس کے تیسرے اجلاس کی روداد ہے جو ۲۷ سے ۳۰ دسمبر ۱۸۸۷ء کو مدراس میں ہوا تھا، کانگریس ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی اور اسی کی رہنمائی میں ملک کو انگریزوں کی غلامی سے نجات ملی اور ۱۹۴۷ء میں وہ آزاد ہوا، اِس وقت اردو کے سلسلہ میں کانگریسی حکومت کا رویہ چاہے جو بھی ہو لیکن شروع میں کانگریس کے سالانہ جلسوں کی روداد اردو میں بھی شایع ہوتی تھی، اتر پردیش اردو اکاڈمی کی جد و جہد سے اس کے تیسرے اجلاس کی رپورٹ دستیاب ہوئی اور اکاڈمی نے اب اس یادگار اور تاریخی دستاویز کو شایع کرکے ضایع ہونے سے بچا لیا، اس میں کانگریس کے پہلے اور دوسرے اجلاس کی کارروائی کا خلاصہ بھی آگیا ہے جو بالترتیب بمبئی اور کلکتہ میں آخر دسمبر ۱۸۸۵ء و ۱۸۸۶ء میں ہوئے تھے، اس کے علاوہ حکومت برطانیہ نے ہندوستان سے ۱۸۳۳ء کے بعد مراعات و حقوق دینے کے جو وعدے کیے تھے ان کا ذکر بھی ہے، کانگریس نے ملک کی مکمل آزادی کا رزولیشن بعد میں منظور کیا، شروع میں اس کے اغراض و مقاصد محدود تھے اس کا اندازہ رپورٹ میں دیے گئے سوال و جواب اور راجہ سرٹی مادھو راے کے سی۔ ایس۔ آئی کی منقول تقریر سے ہوتا ہے، پھر تیسرے اجلاس میں منظور کی گئی تجویزیں اور تیسرے اجلاس کے چار دنوں کی مفصل کارروائی درج ہے، آخر میں صوبہ وار ان لوگوں کے ناموں کی فہرست دی ہے جو تیسری انڈین نیشنل کانگریس منعقدہ مدراس میں شریک ہوئے تھے، اس میں ہر ڈیلی گیٹ کے ضلع، تعلیمی ڈگری، ذات، مذہب اور پیشہ وغیرہ کی صراحت بھی کی گئی ہے، شروع میں اتر پردیش اردو اکاڈمی کے سابق صدر جناب علی جواد زیدی نے اپنے مقدمہ میں اس رپورٹ پر بہت اچھا تبصرہ کیا ہے، اس سے مختلف پہلوؤں سے رپورٹ کی اہمیت واضح ہوتی ہے، انھوں نے رپورٹ کے ناشر اور غالباً مرتب جناب گنگا پرشاد ورما کے بارے میں بڑی تحقیق و جستجو سے مفید معلومات تحریر کیے ہیں اور اس پر بھی اچھی بحث کی ہے کہ شروع ہی سے ذی اثر مسلمان بھی انڈین نیشنل کانگریس میں شریک تھے، اس رپورٹ سے کانگریس کے قیام کا خاکہ بھی سامنے آتا ہے اور اس دور کے بعض سیاسی و معاشرتی مسائل و حالات سے بھی واقفیت ہوتی ہے، اتر پردیش اردو اکاڈمی نے اردو میں جد و جہد آزادی سے متعلق منتشر اور کمیاب تحریروں کو شایع کرنے کا جو پروگرام بنایا ہے، یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس کی اشاعت پر اکاڈمی تحسین کی مستحق ہے۔

ذاکر صاحب اپنے آئینہ لفظ و معنی میں مرتبہ جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۲۲ مع خوبصورت جلد، قیمت ۴۵ روپیے، پتہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کی ذات میں قدرت نے علم و عمل کی گوناگوں قابلیتیں جمع کر دی تھیں، وہ ہمارے ملک کے مشہور مفکر، ماہر تعلیم اور بڑی دلنواز شخصیت اور پاکیزہ سیرت کے مالک تھے، اردو کے مشہور اہل قلم جناب ضیاء الحسن فاروقی کو ان سے خاص تعلق رہا ہے اور وہ ان کے بڑے مرتبہ شناس بھی ہیں، انھوں نے مرحوم کی ۹۰ ویں سالگرہ کے موقع پر ان کے انگریزی مضامین کے اردو ترجمے، متعدد نایاب اردو تحریروں اور تقریروں اور بعض اہم اور غیر مطبوعہ مکاتیب کا یہ مجموعہ خاص سلیقہ سے شایع کیا ہے، اس سے مرحوم کی شخصیت و سیرت کے گوناگوں پہلو سامنے آتے ہیں اور اس میں ان کے افکار و تصورات علمی و تعلیمی نظریات اور مذہبی و قومی خیالات کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے اور اس سے ان کے تدبر،

ہوش مندی، سیاسی بصیرت اور ملک و قوم سے خلوص و محبت کے جذبہ کا اندازہ بھی ہوتا ہے، اس کے پہلے حصہ میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے نام ذاکر صاحب کے کچھ خطوط دیے گئے ہیں، جن سے دونوں بزرگوں کے تعلقات کے علاوہ ذاکر صاحب کی طبیعت کے اعتدال، ضبط و تحمل، حق پسندی اور حق طلبی وغیرہ کا پتہ چلتا ہے، اس حصہ میں وہ اہم خط بھی درج ہے جس میں انھوں نے ملک کی تقسیم کے ہولناک زمانہ میں اپنے اوپر گذرے ہوئے واقعہ کی روداد تحریر کی ہے اس حصہ کے شروع میں لایق مرتب نے دونوں بزرگوں کے تعلقات پر اپنے دلکش و دلآویز انداز میں بڑی دلچسپ تحریر لکھی ہے اور اس کا عنوان "الفت موج و کنار" رکھا ہے جس سے ان کے حسن ذوق کا اندازہ ہوتا ہے، دوسرے حصہ میں ذاکر صاحب کے مضامین خطبات اور تقریریں درج ہیں، ان سے قومی تعلیم کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں اور ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کو اپنی قومی و شخصی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں رہنمائی بھی ملتی ہے، ذاکر صاحب جس زمانہ میں جمہوریۂ ہند کے نائب صدر تھے، معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کو "جامعہ ملیہ" کی سن گن ملی تھی اور انھوں نے ذاکر صاحب سے اسکی وضاحت چاہی تھی، چنانچہ انھوں نے اپنے ایک والانامہ میں مولانا کو لکھا کہ "جامعہ میں ذریعہ تعلیم جہاں تک میں جانتا ہوں اب بھی اردو ہے اور حکومت نے جامعہ کو یونی ورسٹی کا درجہ دیتے وقت اس قسم کی کوئی شرط نہیں کی ہے کہ جامعہ اپنے نصاب تعلیم یا ذریعۂ تعلیم میں کوئی تبدیلی کرے" (ص۲۰) لیکن اب جامعہ ملیہ نے اردو ذریعہ تعلیم کو ختم کرکے مولانا دریابادیؒ کے اندیشہ کو درست ثابت کر دیا ہے اور حکومت نے ذاکر صاحب کی صفائی کا پاس و لحاظ نہیں کیا، اس کتاب سے ذاکر صاحب کی سیرت و شخصیت کے بہت سے جلوے سامنے آتے ہیں اور ان کے سنجیدہ اور پُر مغز خیالات بھی معلوم ہوتے ہیں، اس لیے یہ مطالعہ کے لائق ہے۔

"ض"